نگار

جلد ۲۷ | فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۵ء | شمارہ ۴

ملاحظات		۲
پارسی اہل کتاب ہیں	سید وجاہت حسین ایم۔اے	۶
ستارہ	اختر انصاری بی۔اے	۹
مصطفےٰ کمال پاشا کی ابتدائی زندگی		۲۳
ظلم و استبداد کے خلاف ایک خاموش جنگ	الیاس (اسلام پوری)	۲۹
ئٹزرلینڈ کا آئینِ حکومت	(ڈاکٹر) سید نجم الدین احمد جعفری (بیرسٹر)	۳۲
ب المراسلۃ والمناظرہ		۳۷
توبات نیاز		۴۲
باب الانتقاد (جناب سیاب اکبرآبادی کا مجموعۂ نظم)		۴۹
اسد اللہ الغالب	سید محمد بادشاہ حسینی قادری (حیدرآبادی)	۶۱
باب الاستفسار		۶۴
مطبوعات موصولہ		۶۸
یوں ہوتا تو کیا ہوتا	اختر حسین رائے پوری بی۔اے	۷۰

آیندہ جنوری ۳۶ء کا نگار ہندی شاعری کیلئے مخصوص ہوگا اور ۲۵۰ صفحات پر شایع ہوگا

نگار

ایڈیٹر :- نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اپریل ۳۵ء	جلد ۲۷

ملاحظات

ہم اور ہماری موجودہ تعلیم

تعلیم، تعلیم! جدھر جائیے یہی آواز کانوں میں پڑتی ہے، جس قاید و رہنما کو دیکھئے وہ ملک کی نجات کا ذریعہ تعلیم ہی کو بتاتا ہے۔ نئے نئے مدارس کھلتے جا رہے ہیں، بڑے بڑے کالج تعمیر ہو رہے ہیں، طلبہ کی کثرت سے تعلیم گاہوں میں تل رکھنے کی گنجایش نہیں ۔۔ لیکن فلاح کی منزل کہاں ہے، ہم اس سے کس قدر قریب پہونچ گئے ہیں؟ - یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہمیں کسی طرف سے نہیں ملتا۔

جس وقت لفظ تعلیم ہماری زبان سے نکلتا ہے تو گویا کلیۂ مسلمہ کے طور پر ہماری مراد اُس سے انگریزی تعلیم ہوتی ہے لیکن انگریزی تعلیم کی کیا حقیقت ہے اسکے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے ہندوستان میں اسکے رواج پر مختصراً ایک تاریخی نگاہ

ڈال لیجائے۔

اب سے سوا سو سال قبل جب ہندوستان میں انگریزوں کی جماعت ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے اپنا استبدادِ حکومت آہستہ آہستہ قائم کر رہی تھی، نہ باشندگانِ ہند کے سامنے انگریزی تعلیم کا کوئی سوال پیش تھا اور نہ کمپنی اپنی تجارتی اغراض سے ہٹ کر اس طرف کوئی توجہ کرنا ضروری سمجھتی تھی بلکہ یہاں کی قدامت پرستیوں سے اس کو اندیشہ تھا کہ مبادا مغربی تعلیم کی تحریک لوگوں میں بددلی پیدا کر دے جو کمپنی کے مقاصد کے منافی تھا۔ چنانچہ وارن ہسٹنگز نے تالیف قلوب کے لئے منجملہ دیگر تدابیر کے ایک تدبیر یہ بھی کی کہ مشرقی علوم و فنون کی ترقی میں کافی حصہ لیا اور جب ۱۸۱۳ء ایک لاکھ روپیہ ترویجِ تعلیم کے لئے بجٹ میں منظور کیا گیا تو سنسکرت اور عربی ہی کی اشاعت میں صرف ہوا اور دوسرے سال کمپنی کے ڈائرکٹروں نے گورنر جنرل کو ہدایت کی کہ وہ ہندوؤں کی قدیم روایات تعلیم و معاشرت میں کوئی دخل نہ دے بلکہ جہاں تک ممکن ہو اپنے رسم و رواج پر قائم رہنے کے لئے اُن کی مالی امداد بھی کرتا رہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جس قوم کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا، اُسی کے ایک فرد نے سب سے پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اس کا نام موہن رائے تھا جو بنگال کا ایک برہمن تھا اس نے ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیر کی مدد سے جو کلکتہ میں گھڑیوں کا تاجر تھا مغربی تعلیم کا سب سے پہلا ادارہ ہندو کالج کے نام سے قایم کیا اور ہر چند اول اول عیسائی مشنریوں اور ہندوؤں نے اس کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا لیکن پندرہ سال کے اندر اندر اس تعلیم گاہ نے کافی اثر پیدا کر لیا اور متعدد انگریزی مدارس قائم ہو گئے۔

اس کے بعد ۱۸۱۸ء میں عیسائی مشنریوں نے سیرام پور میں کالج قائم کیا جس کا مقصود صرف مذہبی تبلیغ تھا لیکن اس کے بارہ سال بعد ایک مشنری الگزنڈر ڈف نے تبلیغ کے بجائے تعلیم پر زیادہ زور دینا مناسب سمجھا اور کلکتہ میں دوسرا اسکول و کالج قایم کیا۔

بمبئی میں مغربی تعلیم کا آغاز ۱۸۲۷ء سے ہوتا ہے جب وہاں الفنسٹن کالج قائم ہوا، لیکن مدراس میں ۱۸۱۴ء ہی سے مشنریوں نے اپنے مدارس قائم کرنا شروع کر دئے تھے اور اس لئے جب ۱۸۳۷ء میں وہاں کرسچین کالج قائم ہوا تو انگریزی تعلیم کا ذوق لوگوں میں کافی پیدا ہو چکا تھا۔

جب ۱۸۳۵ء میں حکومت کی پالیسی بدلی تو لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانہ میں تعلیمی فنڈ کی اعانت صرف ان مدارس کیلئے مخصوص کر دی گئی جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی اور حکومت کی یہ سب سے پہلی موثر تدبیر تھی جو اس نے مغربی تعلیم کے رواج کے لئے اختیار کی۔ اس کے بعد ۱۸۳۷ء میں عدالتوں کی زبان بھی بجائے فارسی کے انگریزی کر دی گئی اور ۱۸۴۴ء میں سر ہنری ہارڈنگ نے یہ اعلان کر کے کہ ملازمت کے لئے ان لوگوں کا حق مرجح سمجھا جائے گا جو انگریزی جانتے ہیں، ایک مستقل بنیاد مغربی تعلیم کی قایم کر دی۔ ہر چند اسوقت تک مسلمانوں میں کوئی مسلمان تعلیم انگریزی کا پیدا نہ ہوا تھا لیکن خود ہندوؤں کے اندر اس کا ذوق اس حد تک پہونچ گیا کہ جدید مدارس کی کثرت کے مقابلہ میں حکومت کے ذرائع امداد بہت

محدود نظر آنے لگے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس وقت تک تمام تعلیمی ذوق صرف اونچے درجے کے لوگوں تک محدود تھا اور ادنیٰ طبقہ کی تعلیم کی طرف نہ اہل ملک نے توجہ کی تھی اور نہ حکومت نے۔ اس طرف سب سے پہلے سنہ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس ووڈ کی تجویز و سفارش پر توجہ کی گئی اور تعلیمی پالیسی میں ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو شامل کرکے محکمۂ تعلیمات عامہ قائم کیا گیا۔ اس جدید پالیسی کی رو سے حکومت کی امداد صرف سرکاری مدارس ہی تک محدود نہ رہی بلکہ پرائیویٹ مدارس کو بھی اس میں داخل کر لیا اور اسی سلسلہ میں کلکتہ، مدارس اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ چونکہ یہ یونیورسٹیاں زیادہ تر حکومت کی امداد سے چل رہی تھیں اس لئے حکومت کا اثر ان پر ہونا چاہئے تھا لیکن سنہ ۱۸۹۲ء کے تعلیمی کمیشن نے حکومت کے ان اثرات کو کم کرکے پبلک کے مساعی کو زیادہ اُبھارنا چاہا اور حکومت نے اس تحریک کو پسند بھی کیا کیونکہ اس طرح تعلیمی مصارف کا بار اس کے سر سے کم ہو جاتا تھا۔ مگر عملاً اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور یونیورسٹیوں کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے پھر یونیورسٹی کمیشن قائم کیا اور سنہ ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹی ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے حکومت نے یونیورسٹیوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مدارس، یونیورسٹیوں کے ماتحت کر دئے گئے۔

اس کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنی مجلس عاملہ میں ممبر تعلیم کا اضافہ کرکے اس مسئلہ کو مرکزی اہمیت دیدی اور جب سنہ ۱۹۱۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے اپنی رپورٹ شایع کی تو حکومت نے منجملہ دیگر اصلاحوں کے جن کا تعلق زیادہ تر نظم و نسق سے تھا اس اصلاح پر بھی زور دیا کہ الحاقی قسم کی یونیورسٹیوں کے بجائے ان کو مقامی ہونا چاہئے اور جب سنہ ۱۹۱۹ء میں رفارم ایکٹ کا نفاذ ہوا تو ہر صوبہ میں ممبر تعلیم کی نئی جگہ پیدا کرکے اس کو صوبہ کی حکومت سے متعلق کر دیا گیا۔ اور ہر چند ابتدائی مدارس زیادہ تر ہر ضلع کی میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ سے متعلق ہیں، لیکن ان کی نگرانی حکومت ہی کرتی ہے۔

اس وقت تمام ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی ادارے جن میں ابتدائی و ثانوی مدارس، ہائی اسکول، کالج وغیرہ سب شامل ہیں، تقریباً ۲۵،۷۷،۹۲ ہیں اور سوا کرور سے زیادہ طالب علم ان اداروں میں مصروف تعلیم نظر آتے ہیں جو ہندوستان کی آبادی کو دیکھتے ہوئے کم نہیں ہے اور جس کو دیکھ کر ایک شخص یہاں کے تعلیمی نظام اور حکومت کی تعلیمی پالیسی کے متعلق اچھی رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس تمام داستان میں آپ کو کسی ایک جگہ بھی یہ سمجھنے کا موقعہ ملا ہے کہ انگریزی تعلیم کا نصاب ہندوستان میں کس اجتماعی یا عمرانی مصلحت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا اور کس "جذبۂ انسانیت پرستی" کے ماتحت حکومت نے یہاں تعلیم کو رواج دینا چاہا ہے۔

یہ بات بہت مشہور ہے کہ انگریزوں کا مقصد ہندوستان میں تعلیم رائج کرنے سے صرف اس قدر تھا کہ اُنکو دفتر کے لئے کلرک کافی تعداد میں ملتے رہیں جو انگریزی زبان میں معمولی خط و کتابت کر سکیں اور دفتر کے کاغذات اس زبان میں

مرتب رکھ سکیں۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ حکومت کا مدعا تعلیم سے ایک تعداد ایسے خادموں کی فراہم کرنا تھا جو بہت کم اُجرت پر قیام سیاست میں اس کی مدد کر سکیں۔

جس وقت ہم انگریزی تعلیم کے نتائج پر غور کرتے ہیں تو ہمکو نہ صرف اس قول کی صحت کا بڑی حد تک اعتراف کرنا پڑتا ہے بلکہ ہم ان مضرتوں کو بھی محسوس کر سکتے ہیں جو اصولاً اس نوع کی تعلیم سے پیدا ہونی چاہئے تھیں۔

اگر ہم تعلیم کے صحیح مقصد کو کسی ایک جملہ میں ظاہر کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ "تعلیم کی حقیقی غایت ملک وقوم میں احساس خودداری پیدا کرنا ہے" اور یہ حقیقت اتنی واضح و روشن ہے کہ آپ جس ملک کے نظام تعلیم پر غور کریں گے، وہاں بہ لحاظ نتیجہ و غایت آپ کو یہی ایک چیز سب میں مشترک نظر آئے گی، لیکن جسوقت ہم ہندوستان میں اس کی جستجو کرتے ہیں تو ہمکو نتیجہ بالکل اس کے برعکس نظر آتا ہے اور غالباً دنیا کی تاریخ تعلیم و تعلّم میں یہ بالکل پہلی مثال نظر آئے گی کہ ایک قوم کے احساس غیرت و خودداری کا محو کرنے والا اس کا نصاب تعلیم تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اول اول ایسٹ انڈیا کمپنی نے علوم مشرقیہ ہی کی طرف توجہ کی تھی، لیکن اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ افرادِ قوم کے جذبۂ ملی کو اُبھارنا چاہتی تھی، بلکہ مقصود یہ تھا کہ یہاں کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کریں اور ان کی زبان سیکھ کر ان کے جذبات پر اقتدار حاصل کر سکیں، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں کی غلامانہ ذہنیت کے لئے اتنی زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں اور بغیر کسی مزید انتظار یا اندیشۂ ردعمل کے اپنے مقصد کا اظہار کیا جا سکتا ہے، تو یہ تمام نمائشیں علوم مشرقیہ کی ختم کر دی گئیں اور صاف صاف کہدیا گیا کہ ہمکو تو صرف انگریزی جاننے والے خادموں کی ضرورت ہے، چند ایسے چاکروں کی ضرورت ہے جو ہماری زبان میں ہمارے احکام سنکر ان کی تعمیل کر سکیں، اور خلاف حقیقت ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اہل ہند نے اس صدا پر لبیک کہنے میں پس و پیش سے کام لیا۔

جس طرح ہندوستان میں اس وقت دو جماعتیں نظر آتی ہیں، اسی طرح اُس وقت بھی پائی جاتی تھیں، اور دونوں کی ذہنیتیں اس وقت بھی ایک نہ تھیں اور اب بھی نہیں ہیں۔ اُسوقت مسلمانوں کا جذبۂ خودداری اس لحاظ سے کہ ان کی سلطنت کے مٹے ہوئے نشانات ہنوز تازہ تھے، اتنا مجروح ہوا تھا اور ہندو جن پر محکومیت و غلامی کی صدیاں گزر چکی تھیں اس احساس کو بالکل کھو بیٹھے تھے، چنانچہ یہی سبب تھا کہ سب سے پہلے جس نے انگریزی زبان سیکھنے کی طرف توجہ کی وہ ہندو جماعت تھی مسلمانوں کا پس و پیش ہر چند صرف اس لئے تھا کہ وہ انگریزوں کو اپنی سلطنت و حکومت کا غاصب سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ اس کو پیش کیا گیا مذہبی رنگ میں اور ہمارے علمائے کرام نے بجائے اس کے کہ وہ جذبۂ قومی کو اُبھارتے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کے جھگڑوں میں ڈالدیا اور مسلمانوں کے اس احساس سے جو مفید نتائج پیدا ہو سکتے تھے وہ سب خواب و خیال ہو گئے۔

ہم ابتدائی صفحات میں ظاہر کر چکے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے اسی امر کی کوشش کی کہ وہ یہاں کے علوم کو زندہ کرے، اور اسی لئے اس نے انگریزی سیکھنے پر دوسروں کو مجبور نہیں کیا بلکہ خود وہ یہاں کی زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوئے

لیکن جب بعد کو انگریزوں نے محسوس کیا کہ یہاں کی قومیں خود اپنی زبان اور اپنے علوم کی طرف متوجہ نہیں ہیں تو انھیں کیا غرض پڑی تھی کہ وہ خواہ مخواہ یہ دردِ سر مول لیتے۔

ممکن ہے ہندو جماعت اس پر فخر کرے کہ سب سے پہلے انھیں کے ایک فرد نے کلکتہ میں ہندو کالج قائم کرکے انگریزی سیکھنے کی طرف ملک کو مایل کیا، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہی سب سے پہلی غلطی تھی جس نے ہوا کا رُخ پھیر دیا اور ہندوستان کے تعلیمی مستقبل کو تاریک کرکے رکھدیا۔

اس میں شک نہیں کہ علم محض کسی مخصوص زبان کا پابند نہیں ہے اور اجنبی ممالک و اقوام کی زبان سیکھنا بھی مستحسن ہے، لیکن اگر ہمارا یہ ذوقِ علم و زباندانی ہماری قومی خصوصیات کو چھین لینے والا اور ہماری اپنی زبان کو مٹا دینے والا ہے تو ایسے علم سے جاہل و بے علم رہنا بدرجہا بہتر ہے۔

اگر ہندوؤں نے سب سے پہلے انگریزی سیکھنے کی طرف توجہ کی تھی تو اس سے مقصود صرف یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اس کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کریں اور پھر اپنی ہی زبان کی وساطت سے ملک میں ان کو رواج دیں، نہ یہ کہ انگریزی زبان ہی کو اصل مقصود قرار دیکر حکومت کی گرفت کو اور زیادہ مضبوط بناتے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو کالج کے بانی کا نصب العین صرف یہ تھا کہ وہ ہندوؤں کو انگریزی زبان کی تعلیم سے آشنا کرکے، نوکری کا حصول اُن کے لئے آسان کردے جس کا اتباع بعد کو سر سید مرحوم نے بھی کیا اور اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ ہندو مسلمانوں کے بعض افراد کو چاکری کا ڈھب معلوم ہو گیا لیکن تعلیم کے حقیقی فوائد سے یہ بھی محروم رہے اور وہ بھی۔

تعلیم کی برکات ثابت کرنے کے لئے مخصوص افراد کی نظیر پیش کرنا سخت حماقت ہے، کیونکہ تعلیم کا مسئلہ بالکل اجتماعی مسئلہ ہے اور جب تک اُس کی اجتماعی اہمیت پیش نظر نہ ہو اس کے حُسن و قبح پر ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اگر کسی ملک کا کوئی مخصوص طبقہ پڑھ لکھ کر ترقی کر جائے تو ہم اس کو تعلیم کی برکات میں تو ضرور شمار کریں گے لیکن نظام تعلیمی اسی وقت مکمل کہا جائیگا جب اس کے برکات بلاتخصیص طبقہ و درجہ سب پر موثر ہوں اور ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز اُٹھ جائے۔ پھر آج کہ انگریزی تعلیم کے رواج کو ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے غور کیجئے کہ اس نے ملک کو کتنا فایدہ پہونچایا اور ہماری ذہنی ترقیوں نے ہمارے تمدن و اخلاق میں کیا خوشگوار تبدیلیاں پیدا کیں۔

سب سے پہلے آپ ہندوستان کے اس طبقہ کو لیجئے جو جسم قومی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور جو صحیح معنی میں ہمارا "ان داتا" ہے۔ اگر آپ کو کسی گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے وہاں کی آبادی کا مطالعہ کیا ہوگا اور اگر آپ کے دل میں کچھ بھی اہلیت تاثر کی موجود ہے تو آپ ان کو دیکھ کر یقیناً حیران رہ گئے ہوں گے کہ کیا یہ واقعی اُسی خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہے جس نے متمدن ممالک کے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور کیا حقیقتاً ہم ان کا شمار انسانوں میں کر سکتے ہیں۔ اُن کے اسباب غذا (اگر فاقہ کر کرکے زندہ رہنے میں واقعی غذا کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے) اُن کے ملبوس (اگر حقیقتاً جامۂ تار تار کا شمار ملبوس

میں ہو سکتا ہے) اُن کے مکانات (اگر کسی موسم میں پناہ نہ دے سکنے والے جھونپڑے مکان کہلائے جا سکتے ہیں) اُنکی صحت و توانائی (اگر بیماریوں کا شکار ہو ہو کر اسباب علاج فراہم نہ ہو سکنے کی وجہ سے مرتے رہنا واقعی صحت و توانائی کی بات ہے) الغرض ان کی بیکسانہ زندگی کے جس پہلو پر آپ نظر کریں گے تو آپ مجبور ہوں گے کہ یا تو انسانوں میں ان کا شمار ہی نہ کریں یا پھر اپنی انسانیت پر آنسو بہائیں جو ان مناظر سے دوچار ہوتی ہے اور بیخبرانہ گزر جاتی ہے۔ اگر تعلیم کا فائدہ کم از کم اتنا ہی قرار دیا جائے کہ وہ انسان و حیوان کے درمیان جس امتیاز پیدا کر دیتی ہے تو افسوس ہے کہ سوا سو سال کی تعلیمی جد و جہد ملک کی کثیر آبادی کو اس احساس سے آشنا کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئی اور ہندوستان کے نصف سے زیادہ باشندے بدستور اس عہد وحشت کی زندگی بسر کر رہے ہیں جب آدم کو بہشت سے نکلے ہوئے شاید چند ہی سال ہوئے ہونگے اجتماعی یا تمدنی احساس تو خیر بڑی چیز ہے، انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ زندہ رہنے کی صورتیں، بھوکے رہکر صرف سانس لیتے رہنے کے علاوہ اور بھی ہو سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج تعلیم کا چرچا گھر گھر ہے اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہیں ہے جہاں علم کی روشنی نہ پہونچ گئی ہو۔ ممکن ہے اس کی تصدیق حکومت کے بجٹ طیار کرنے والے یا ڈسٹرکٹ بورڈ و میونسپلٹی کی صدارت کے لئے خاک چھاننے والے کر سکیں، لیکن گاؤں کی وہ آبادی جس سے تعلیم کے نام پر روپیہ چھین کر، کبھی صحیح معنی میں اس پر صرف نہیں کیا جاتا، شاید اس کی تصدیق نہ کرے۔

یہ حال تو ہوا اُس طبقہ کا جسے باوجود اساسِ معیشت سمجھنے کے ادنیٰ طبقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اب متوسط الحال طبقہ کی تعلیمی حالت پر غور کیجئے، جو ماہرین تمدن کے نزدیک ترقی علوم و فنون کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس طبقہ کے افراد بہ کثرت نظر آتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ہر سال یہاں کی انتہائی تعلیم کا پروانۂ فراغ لیکر باہر نکلتے ہیں۔ لیکن جسوقت اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی یا ملک کی ترقی میں کیا حصہ لے رہے ہیں تو نتیجہ حد درجہ افسوسناک نکلتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جس کی ایک تعلیم یافتہ انسان میں جستجو ہونا چاہئے، اس کا جذبۂ خودداری ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے ابنائے وطن کا وقار قائم رکھنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے، سو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سب سے زیادہ اسی احساس کا فقدان ہے، وہ مغرب اور ہر اس چیز سے جو مغرب کی کہلاتی ہے، اس درجہ مرعوب ہیں کہ ان کے نزدیک شائستگی و تہذیب کا صحیح معیار انگریز ہو جانا ہے۔ انگریز وضع و صورت کے لحاظ سے، معیشت و معاشرت کے لحاظ سے۔ عوائد و مراسم کے لحاظ سے۔ ذہنیت کے لحاظ سے نہیں کیونکہ انگریز تو اپنے ملک پر قربان ہونے کے لئے طیار رہے اور اس جذبہ کا یہاں پتہ نہیں، اس کا اصل سبب وہی اصول تعلیم کی خرابی ہے۔ جب تک ایک ملک کے باشندوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم نہ دیجائے گی، اُسوقت تک نہ اُن میں کوئی ذہنی ترقی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ جذبۂ وطنیت انمیں نشو و نما پا سکتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب ہم نصاب تعلیم پر غور کرتے ہیں تو اور زیادہ افسوس ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سب سے

زیادہ جس چیز کو اہمیت دی جاتی ہے وہ صرف انگریزی زبان ہے اور شروع سے ہمارے نوجوانوں پر اس کی اہمیت اتنی ثابت کر دیجاتی ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصود بجز زبان انگریزی کی مہارت کے کچھ نہیں رہتا اور اسکا نتیجہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنی قومی روایات سے ان کو بیگانگی پیدا ہوجاتی ہے اور اپنا تفوق وہ اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے آپ کو ایک اچھا انگریزی داں ثابت کر سکیں، درانحالیکہ ان کی انگریزی دانی کی بھی جو حقیقت ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

وہ جب بات کرتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ جتنے الفاظ انگریزی کے انھیں یاد ہیں سب صرف کر دیں، جب وہ کسی کلب میں جاتے ہیں تو صرف انگریزی رسایل و جرایدہی کی جستجو کرتے ہیں اور ان کو شرم معلوم ہوتی ہے کہ لوگ انھیں اُردو یا ہندی کے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ لیں۔ اپنی زبان میں بات کرنا، اپنی زبان کی کتابوں کو دیکھنا، اپنی زبان کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا ان کے نزدیک جہل و وحشت کی علامت ہے، توہین و خفت کا سبب ہے اور ایک ایسی ادنیٰ ذہنیت کا اظہار ہے، جسے وہ گوارا نہیں کر سکتے —— خیر یہ تو بڑی بات ہے کہ وہ کسی انگریز سے گفتگو کرتے وقت یہ سمجھ کر کہ اُس کو بھی ہمارے ملک کی زبان جاننا چاہئے، اپنی مادری زبان میں خطاب کریں —— وہ تو آپس میں بھی جب تبادلۂ خیالات کریں گے تو انگریزی میں اور اگر مخاطب انگریزی میں جواب نہ دیگا تو اسکو حقارت سے دیکھیں گے۔ الغرض جلوت و خلوت ہر جگہ وہ انگریز بننے کی کوشش کرتے ہیں، درانحالیکہ ایک انگریز کی نگاہ میں وہ صورتاً و سیرتاً، اتنے ہی ذلیل ہیں، جتنا انھیں ہونا چاہئے کیونکہ ایک انگریز بھی ہماری اس غلامانہ ذہنیت سے واقف ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ جس قوم کے افراد اتنے بے غیرت اور بے حس ہوں اور جس ملک کے باشندوں میں اپنے وطن کی عزت و خودداری کا احساس اسدرجہ محو ہو گیا ہو، وہ کسی طرح اس کتے سے زیادہ نہیں جو ٹھکرائے جانے کے بعد بھی قدموں سے لپٹے رہنے پر مجبور ہے —— انگریزی زبان کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ہمارے احساس انسانیت کو کیوں محو کر دے۔ کیا جس طرح ایک انگریز، اپنی زبان پر، ایک جاپانی، جاپانی زبان پر اور ایک فرانسیسی اپنی مادری زبان پر فخر کرنے کا حق رکھتا ہے، ہمکو حاصل نہیں اور کیا جس طرح وہ اپنی قومی خصوصیات اپنی قومی زبان کے ساتھ قایم رکھنے پر مُصر ہے، ہم نہیں کر سکتے۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ ہم ایک انگریز سے صرف اسلئے انگریزی زبان میں گفتگو کرتے ہیں کہ وہ اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ہم اپنی زبان میں گفتگو کر کے اس کو اس بات پر مجبور نہیں کرتے کہ جس سرزمین میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے، جس ملک کی دولت سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے، وہاں کی زبان کو بھی وہ سمجھے۔ مانا کہ ہماری زبان نا مکمل ہے وسیع نہیں ہے لیکن ہے بہرحال اپنی چیز، اپنے وطن کی چیز اور اگر ہم اسکو اسوقت تک کوئی ترقی نہیں دے سکے ہیں تو یہ ہمارا قصور ہے نہ کہ زبان کا —— آپ ایک انگریز گریجویٹ اور ایک ہندوستانی گریجویٹ کا مقابلہ کیجئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ جس حد تک کتابیں پڑھنے کا تعلق ہے، ہندوستانی گریجویٹ بدرجہا افضل ہے لیکن دنیا کے کاروبار میں، عملی زندگی میں، سوجھ بوجھ میں ایک انگریز گریجویٹ بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اسکی تعلیم اسکی مادری زبان میں ہوتی ہے اور آپکا سارا وقت صرف غیر زبان سیکھنے میں صرف ہو جاتا ہے، علاوہ اس کے وہ پڑھتے ہیں اپنے قوائے ذہنیہ کو عالمانہ طور پر بروئے کار لانے کے لئے اور آپ پڑھتے ہیں گدایانہ طور پر نوکری کرنے کے لئے۔

(باقی آیندہ)

پارسی اہل کتاب ہیں

(مسلسل)

پارسیوں کے مذہبی ادبیات

دین زرتشتی کے اُصول کی تشریح سے قبل اُس کی مذہبی کتب و تصانیف کا مختصر ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جب سکندر اعظم نے ایران فتح کیا اور ۲۳ سال قبل مسیح پایۂ تخت فارس کو نذر آتش کیا تو تمام وہ تصنیفات و مخطوطات بھی ضایع ہو گئے جن کا تعلق قدیم ایرانی تمدن و فلسفہ اور دیگر علوم سے تھا۔[1] اس غارت گری میں دین زرتشتی کی مذہبی کتابوں اور مقدس ادبیات کو اسقدر نقصان پہونچا کہ آج اس مذہب کے متعلق مکمل حالات معلوم کرنے اور ہم پہونچانے کی کوئی قابل وثوق صورت نظر نہیں آتی۔ موجودہ اوستا اصلی اوستا کا ایک جزو ہے اور اس کا بھی یہ حال ہے کہ اکثر دیگر ابواب کے جملے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ موجودہ اوستا کی تدوین اصلی اوستا کی بربادی کے سالہا سال بعد عہد ساسانی میں ہوئی ہے۔ اور اس کی ترتیب یوں ہوئی کہ زرتشتی علماء کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اور ان علماء کے ذہن میں جو کچھ باتیں اور جملے اصلی اوستا کے محفوظ تھے اُنھیں قلمبند کر دیا ظاہر ہے کہ اس طرح اصل خیالات میں کتنا ردو بدل ہو گیا ہوگا۔[2]

اس امر کا ثبوت کہ آیا زرتشتی ادبیات کا وجود یونانی فتح سے قبل تھا یا نہیں، ایک یونانی مصنف ہرمپو کی تحریر سے ملتا ہے جس نے پارسیوں کے مذہبی ادبیات کی ایک مفصل فہرست مع عنوانات و مضامین تیار کی تھی۔ سکندر اعظم کی غارتگری کے بعد زرتشتی کتابوں کا محفوظ رہنا دشوار تھا تاہم کچھ باقی رہگئی تھیں لیکن اُن کا خاتمہ بھی ساسانی عہد میں ہو گیا۔[3] اس کے بعد عہد خلافت عباسیہ میں اس ادبی تباہی اور نقصان کی کسی حد تک تلافی کی گئی یعنی سلطنت نے اپنے خرچ سے قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب کو جمع کرایا اور ترجمہ کرا کر کتبخانوں میں انکو محفوظ کر دیا۔[4]

---

[1] تفصیل کے لئے مغربی و مشرقی علماء کی اُن تواریخ کا مطالعہ اس سلسلہ میں ضروری ہے جو انھوں نے تمدن ایران پر تصنیف کی ہیں۔ طبری شہرستانی، جیکسن، مارخم اور ٹائل کے مصنفات خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ براؤن کی تاریخ ادبیات ایران اور مالکم کی تاریخ ایران بھی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ [2] دائرۃ المعارف برطانیہ۔ میڈیا مصنفہ راگزن۔ تاریخ پارسیان۔ مضامین ہاگ اور شرح مذہب زردشت مصنفہ دھلا۔ [3] میڈیا صفحہ ۲۷۔ دائرۃ المعارف۔ مضامین ہاگ۔ دین ایرانیان مصنفہ ٹائل اور شہرستانی طبری اور مسعودی کی تصانیف۔ [4] شرح مذہب زردشت اور رسائل شبلی صفحہ ۲۷۔ ۱۷۱۔

طبری (۸۳۸ - ۹۲۲) ناقل ہے کہ زرتشتی تحریریں ۱۲ ہزار چرمہائے گاؤ پر منقش و مرقوم تھیں[1] لہٰذا موجودہ اوستا پروفیسر جیکسن کے تخمینہ کے مطابق محض ۱/۴ حصہ اُس اوستا کا ہے جو عہد ساسانی میں ترتیب پایا تھا[2]۔ بقیہ حصے آخری زرتشتی تاجدار کی حکومت کے بعد غارت ہو گئے۔

ہمیں اس جگہ یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ زرتشتیوں کی مقدس کتاب کی اصل زبان کیا تھی۔ اس کی زبان اوستا تھی۔ یہ زبان آریاؤں کی ایرانی شاخ میں بولی جاتی تھی لیکن آریاؤں کی ایرانی شاخ بھی دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک کو مشرقی ایرانی اور دوسرے کو مغربی ایرانی کے نام سے پکارتے تھے۔ اوستا کی زبان مشرقی ایرانیوں کی زبان تھی جو بیکٹریا اور اُس کے ملحق مقامات میں مروج تھی۔ مذہبی ادبیات کے ایک حصہ کو گاتھا کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حصہ حضرت زرتشت کے کلام پر مشتمل ہے۔ بقیہ مذہبی ادبیات زبان اوستا میں تھے مارخم[3] لکھتے ہیں کہ

"اگر "وید" کو ہم موجودہ کتب میں قدیم ترین کتاب کہہ سکتے ہیں تو بلا شبہ بلحاظ قدامت فارسی گاتھا کا درجہ دوسرا ہے۔ اس کتاب میں ہمیں عناصر فطرت کی پرستش سے بلند تر کسی اور شے کی عبادت کی ابتدا نظر آتی ہے۔ ویدک نظموں اور مناجاتوں میں خالق اعظم اور آیندہ زندگی کے ادراک کا جو موہوم نقشہ ملتا ہے اُسکی تفسیر کے لئے ہمیں گاتھا ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے"۔

مذہبی ادبیات کے چند اجزا، اصلی اوستا کی تفسیر و توضیح پر مشتمل ہیں اور انھیں زند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس مقدس ادبی مجموعہ کو زند اوستا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پھر اجزائے زند کی توضیح اور شرح جن کتب میں مرقوم ہیں انھیں پازند کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ عہد ساسانی میں جو کچھ کتابیں مذہبی مسائل و عقائد پر تصنیف و تالیف ہوئی ہیں اُن کی زبان عہد ساسانی کی مروجہ زبان پہلوی ہے۔

ہمیں اس سلسلہ میں اُن کاوشوں اور کوششوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے جو علمائے مغرب نے پارسیوں کے مذہبی ادبیات کی جستجو اور ان کو منظر عام پر لانے میں کی ہے۔ مشرقی مصنفین میں طبری، مسعودی، شہرستانی، ابوالفدا، یاقوت اور البیرونی نے اپنے تصنیفات میں اس مذہب کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔ ملا محسن فانی کشمیری مصنف دبستان مذاہب نے اِس مذہب کا ذکر بوضاحت کیا ہے اور مجوسی علماء و فضلاء علی الخصوص اُن کا جن سے ہندوستان میں ملاقات کا اُنھیں شرف حاصل تھا خاص طور پر کیا ہے۔

مغربی علماء میں پہلا شخص ہائڈ ہے جو اکسفورڈ یونیورسٹی سے متعلق تھا۔ اس نے مغرب میں سب سے پہلے زرتشتی مذہب اور اُس کے ادبیات کے متعلق تحقیق و تفتیش کی۔ اُس نے ۱۷۰۰ء میں ایک ضخیم کتاب اپنی تحقیقات کے مطابق اِس مذہب پر شایع کی تھی۔ ہائڈ کے بعد مشہور عالم اور سیاح انکیو دو پیرن نے ہندوستان سے فرانس واپس جا کر ۱۷۷۱ء میں زند اوستا کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ شایع کیا۔ بعدہٗ معروف مستشرق سر ولیم جونس نے اس مذہب کے متعلق اکثر مصنفات شایع کئے۔ ۱۸۲۶ء میں ملک ڈین

---

[1] تاریخ ایران جلد اول باب ۱۲ مصنفہٗ مالکم۔ [2] زردشت مصنفہٗ جیکسن۔ [3] تاریخ ایران صفحہ ۳۴۔

رہنے والے ایک عالم نے جن کا نام ایرسمس رسک تھا ایک رسالہ زبان زند اور اس کے ادبیات کے متعلق شایع کیا اُسی زمانہ میں پیرس کے ایک ماہر سنسکرت پروفیسر برنف نے اسی قسم کی ایک تصنیف شایع کی۔ ۱۸۲۹ء میں ہمبرگ کے جسٹس اولشاہنسن اور فرانسس بوپ نے ان لوگوں کی تقلید کی۔ پھر حکومت بویریا کی تحریک پر فریڈرک اسپیجل نے اُن مخطوطات کا ترجمہ کیا جو اسوقت یورپ کے کتب خانوں میں اس مذہب و زبان کے متعلق پائے جاتے تھے۔ ڈاکٹر گیلر کا احسان بھی پارسی مذہب کے ادبیات پر بہت زیادہ ہے۔ ۱۸۵۲-۵۴ء میں ملک ڈین کے مشہور فاضل وسٹر گارڈ نے زند اوستا کو پہلی بار مکمل طور پر کتابی صورت میں شایع کیا۔ اس اشاعت میں اس زبان کے قواعد اور لغت کو بھی بطور ضمیمہ شامل کیا۔ پھر ۱۸۵۸-۶۰ء کے عرصہ میں ڈاکٹر مارٹن ہاگ نے گاتھا کو شایع کیا۔

ڈاکٹر موصوف کا پارسی مذہب اور ادبیات مذہب کے متعلق ایک بسیط مضمون جو ۱۸۶۲ء میں شایع ہوا تھا کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں وسٹ۔ گولڈنر۔ ڈارمسٹیٹر۔ ملس۔ بارتھولومیو اور ٹائل جیسے مستشرقین کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

زند اوستا جو اب گم ہو چکی ہے اکیس جلدوں میں تھی۔ ارد ویراف نامہ سے بالتفصیل معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی ادبیات یونانی حملہ کے وقت سکندر اعظم کے حکم سے کیونکر برباد و تباہ کئے گئے۔ ذیل میں اُن اکیس جلدوں کے نام مع اُنکے پہلوی ناموں کے ہدیۂ ناظرین ہیں۔[1]

اسمائے اوستا	پہلوی نام	اسمائے اوستا	پہلوی نام
(۱) یتا	سودگر	(۱۱) منتگہو	دادرک
(۲) اہو	ورشتمنسار	(۱۲) شکیوتنہ نام	چیدرستو
(۳) ویریو	بکو	(۱۳) انگھی اش	اسپیت
(۴) آتا	دامداد	(۱۴) مزدائی	باکان یشت
(۵) رتش	نادر	(۱۵) خشترمچا	نیکادم
(۶) اشد	پاجک	(۱۶) اہورائی	دبا سرج
(۷) چید	زرتشتی	(۱۷) آ	ہوسپارم
(۸) ھچا	بارس	(۱۸) ییم	سکادم
(۹) ونگھی اش	کشکیسرب	(۱۹) وردگوبیو	وندودام
(۱۰) وزدا	وستاسپساستو	(۲۰) دوت	بادخت
		(۲۱) وستارم	ستودیشت

[1] تاریخ پارسیان - دین زرتشت مصنفہ ممسائی - دائرۃ المعارف - ادبیات مقدسہ مشرقی اور دین ایرانیان - تاریخ ساسانیان کے مصنف نے جو بہ عہد مظفرالدین شاہ گزرا ہے اس سلسلہ میں مفصل حالات قلمبند کئے ہیں۔

پہلے حصے میں ۲۲ ابواب تھے۔ ان میں عبادت و پرہیز گاری کے فوائد سے بحث کی گئی تھی۔
دوسرے حصہ میں بھی ۲۲ ابواب تھے جن میں مذہب زرتشتی کے عقاید سے بحث کی گئی تھی۔
تیسرے حصہ میں بیس یا اکیس ابواب تھے اور ان میں نجات پانے اور گناہوں سے بچنے کا طریقہ بتایا گیا تھا۔
چوتھے حصہ میں ۳۲ ابواب تھے جن میں الٰہیات اور سائنس کے مضامین سے بحث کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حشر و نشر اور آیندہ زندگی کے متعلق مبسوط بحث تھی۔

پانچویں حصہ میں ۳۵ ابواب تھے اور اُن میں علوم ہیئت اور نجوم سے بحث کی گئی تھی۔
چھٹے حصہ میں ۲۲ ابواب تھے اور اُن میں چند مذہبی رسوم اور تیوہار کا تذکرہ تھا۔
ساتویں حصہ میں ۵۰ ابواب تھے اور وہ بادشاہوں۔ عالموں۔ مذہبی رہنماؤں اور دیگر معزز شخصیتوں کے احکام سے معمور تھے۔
آٹھویں حصہ میں ۶۰ ابواب تھے اور اُن میں ملک پر حکومت و سلطنت کرنے کے اکثر عمدہ طریقے بتائے گئے تھے۔
نویں حصہ میں بھی ۶۰ ابواب تھے اور عقلمندی۔ پرہیزگاری۔ مذہبیت۔ نیک و بد اعمال وغیرہ جیسے مضامین پر بحث کی گئی تھی۔
دسویں حصہ کو ایک تاریخی کتاب کہنا چاہئے۔ اس میں ۶۰ ابواب تھے اور اُن میں عہد گشتاسپ اور مذہب زرتشتی کے ابتدائی دور کی تاریخ قلمبند کی گئی تھی۔

گیارھویں حصہ میں ۲۲ ابواب تھے جن میں صفات باری تعالیٰ۔ حشر۔ آفرینش اور تمدنی فرائض کا ذکر تھا۔
بارھویں حصہ میں ۲۲ ابواب تھے اور وہ مسئلۂ زوجگی پر مشتمل تھے۔
تیرھویں حصہ میں ۶۰ ابواب تھے جن میں زرتشت کے ابتدائی حالات زندگی کا تذکرہ تھا۔
چودھویں حصہ میں ۱۷ ابواب تھے جن میں خداوند عالم اور اُس کے مقرب فرشتوں کا ذکر تھا۔
پندرھویں حصہ میں ۵۴ ابواب تھے۔ اس میں دولت جمع کرنے کے متعلق حکایات و قصص بیان کئے گئے تھے علاوہ ازیں حیات کی معصومیت سے بھی بحث کی گئی تھی۔

سولھویں حصہ میں ۶۵ ابواب تھے اور اس میں شادی بیاہ کا تذکرہ تھا۔
سترھویں حصہ میں ساٹھ یا چونسٹھ یا پینسٹھ ابواب تھے اور اُن میں گناہ گاروں کی سزا اور حرام و حلال کے مسئلہ سے بحث کی گئی تھی۔
اٹھارھویں حصہ میں ۵۰ ابواب تھے جن میں اختیارات اور قوت کے صحیح استعمال کا طریقہ مندرج تھا۔
اُنیسویں حصہ کو وھندیداد کہتے ہیں اور اس کا ذکر ہم بوضاحت آیندہ کریں گے۔
بیسویں حصہ میں ۳۰ ابواب تھے جن میں نیکی۔ عبادت گزاری اور بدکاری وغیرہ کے نتیجہ اور انجام سے بحث کی گئی تھی۔
اکیسویں حصہ میں ۳۳ ابواب تھے جن میں اھورامزدا اور اُس کے مقرب فرشتوں کی مدح و ثنا کی گئی تھی۔
ان مذہبی ادبیات کے تذکرہ میں دائرۃ المعارف برطانیہ (جلد ششم طبع نہم صفحہ ۵۲۵) سے ذیل کا اقتباس پیش کر دینا

مناسب معلوم ہوتا ہے:-

"بابل کی دوسری فتح کے بعد ۵۱۵ سال قبل مسیح بہستون کا کتبہ عمل میں آیا جس پر داراکی زبان سے مرقوم ہے کہ اُس نے قدیم کتاب یعنی قانون الٰہی (اوستا) کا ترجمہ کیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ قوانین الٰہی کی ایک تفسیر اور نماز کی ایک کتاب (زند) کا بھی ترجمہ کیا تھا"

ڈاکٹر ہاگ کا خیال ہے کہ پارسیوں کے موجودہ مذہبی ادبیات کا قدیم ترین حصہ زیادہ سے زیادہ پندرہ سو سال قبل مسیح کی تحریر ہے اور زند اوستا بہیئت مجموعی تقریباً ۵۰۰ سال قبل مسیح وجود میں آیا۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر ٹائل کی تحقیق سے آخری حصہ اوستا ۹۰ سال قبل مسیح وجود میں آیا اور گاتھا اُس سے ۲ صدی قبل[1]۔ بہر حال اس بحث و اختلاف کا خاتمہ اس وقت تک ہونا دشوار ہے جب تک جدید محققین خود پیغمبر زرتشت کے عہد وجود اور زمانۂ رسالت کو طے نہ کرلیں۔ جہاں تک زند اوستا کی تصنیف کا تعلق ہے تمام علمائے یونان[2] اور علمائے مذہب زرتشت[3] حضرت زرتشت ہی کو اُس کا مصنف بتاتے ہیں لیکن مارخم کا بیان ہے کہ[4]:-

"یہ خیال قابل وثوق نہیں لیکن اگر زردشت ان لوگوں کو بھی کہتے تھے جو مذہبی قیادت کی خدمت انجام دیا کرتے تھے تو یہ اشکال دور ہوجاتا ہے، زردشت اول یا اس مذہب کے بانی کا نام اسپنتاما تھا"

راگزن نے بھی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے اس مذہب کے علماء[5] کو زردشت کے لقب سے یاد کیا ہے۔

ہرچند کہ متذکرۂ بالا جلدوں اور حصوں کا اب ملنا دشوار ہے لیکن اُن کے مضامین سے مطلع ہونے کے لئے ہمارے پاس دیگر ذرائع موجود ہیں۔ مثلاً زبان پہلوی کی دنکارد اور زبان فارسی کی "روایات" اس سلسلہ میں بے حد معاون ہیں۔ یونانی مصنفین ہیروڈوٹس وغیرہم کے بیانات بھی ہماری مدد کرتے ہیں[6] علاوہ ازیں اصلی حصص کے کچھ اجزا ہنوز باقی ہیں۔ اُنیسواں حصہ وندیداد اور دو کتابیں یسنا اور ویسپارد تو بہ صورت مکمل پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ خورد اوستا کے نام سے بھی ایک کتاب ملتی ہے۔ اس میں محض نماز کا ذکر ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ آخر الذکر تینوں کتابیں اُن اکیس حصص زند اوستا کے کچھ اجزا ہوں۔

ادبیات مقدسہ کی تاریخ کے متعلق ہاگ[7] لکھتے ہیں کہ:-

"ایران کے سماری کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہخمنی سلاطین، اہورامزدا پر ایمان رکھتے تھے اور اُنکی زبان اوستا سے ملتی جلتی کوئی زبان تھی۔ حقیقتاً ہخمنی سلاطین کا عہد زرتشتی ادبیات کے لئے ایک سعید زمانہ تھا اسی عہد میں تمام کتب مقدس ترتیب پاکر اکیس حصص میں منقسم ہوئے اور اُن کا نام نسک پڑا"

---

[1] دین ایرانیان مصنفہ ٹائل و مترجمہ جی. کے. نریمان — [2] مضامین ہاگ، ادبیات مقدسہ مشرقی — [3] دین زرتشت مصنفہ پی. ایس. سانی لیکن شرح مذہب زردشت مصنفہ دھلا سے بھی تقابل کیجئے — [4] تاریخ ایران صفحہ ۵۲ — [5] میڈیا صفحہ ۲۷۲ — [6] ادبیات مقدسہ مشرقی۔ مضامین ہاگ۔ دین ایرانیان — [7] مضامین ہاگ صفحہ ۴۵ — [8] تاریخ ایران مصنفہ مارخم صفحہ ۴۹۔

اس عہد کا پتہ ہمیں "ارداویراف" سے معلوم ہوتا ہے جس میں مرقوم ہے کہ تقریباً تین سو سال تک مذہب زردشت پاکیزہ رہا اور لوگ شبہات سے مبرا رہے۔ ہمیں ادبی مصنفین کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایکبار اسکندر اعظم نے شراب کے نشہ میں اخمنی سلاطین کے پایۂ تخت اور قلعہ کو جلادینے کا حکم دیدیا۔ قلعہ میں ۲ جلد زرتشتی ادبیات مقدسہ بصورت مکمل موجود تھیں اُن میں سے ایک تو جل گئی اور دوسری یونانیوں نے رکھ لی۔ اگر کوئی مکمل یا غیر مکمل جلد بچ بھی رہی ہو تو اُس کا بعد کے ۵۵۰ سال کے عرصہ میں برباد ہو جانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے کیونکہ اس عہد میں یونانیوں نے دین زرتشتی کی کسی قسم کی اعانت نہیں کی۔ اس عہد میں محض ایک نام وہالکاش کا ایسا شاہی جس نے بقیہ کتب واجزا کی فراہمی کا حکم دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو نگار کا چوتھا حصہ)[1]۔ عہد ساسانی کے اولین چند سلاطین نے ان منتشر تحریروں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کا انتظام کیا تھا اور پھر دوسرے امن پسند سلاطین ساسانیہ نے ادبی مشاغل کی ہمت افزائی کی۔۔۔ اب موجودہ ادبیات مقدسہ کی بعض مشہور کتابوں کا ذکر سنئے۔ وھندیداد سے جس میں ۲۲ ابواب ہیں اُن ممالک کا حال معلوم ہوتا ہے جن میں دین زرتشتی کی پہلے پہل تبلیغ کی گئی۔ زرتشتی قوانین اور دیگر رسوم مذہبی کا بھی تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں اُس عظیم الشان واقعہ کا بھی ذکر ہے جس کا بیان تقریباً تمام کتب سماوی والہامیہ میں ہے۔ یعنی لوگوں کی بدکاری اور گناہگاری اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ خداوند عالم نے انھیں سزا دینے کی خاطر دنیا کو ایکبار بالکل تباہ کر دیا اور پھر از سر نو آباد کیا۔ اس کتاب میں مرقوم ہے کہ اُسوقت اہورامزدا نے اپنے چہیتے بندہ جمشید کو حکم دیا کہ وہ ایک حصار تیار کرے اور کل مخلوق کا ایک ایک جوڑا اس حصار میں رکھدے تاکہ وہ سب بربادی و تباہی سے محفوظ رہیں۔ بقیہ مخلوق کی تباہی کا باعث اس کتاب میں شدید سردی اور برف باری بتایا ہے۔

انجیل اور قرآن میں اس واقعہ کو حضرت نوح سے منسوب کیا گیا ہے اور تباہی کا باعث طوفان بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام حالات و واردات وہی ہیں جو وھندیداد میں مرقوم ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر تاراپور والا پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی کا پُر مغز مضمون بعنوان "حکایات بیما" جو کلکتہ ریویو میں شایع ہوا ہے ملاحظہ کرنا چاہئے۔ عرب مورخوں نے جمشید جناب سلیمان کا نام اور لقب بتایا ہو۔ میر خوند کی کتاب حبیب السیر جلد ۳ اور عبدالرحیم تبریزی (سنہ ۱۲۵۹ھ) کی مالک المحسنین کا مطالعہ اس سلسلہ میں مفید ثابت ہوگا۔ پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران جلد اول میں اس نکتہ پر بحث کی ہے۔

دھندیداد لوگوں کو پیشۂ کاشتکاری کی ترغیب دیتی ہے اور اسے ایمانداری اور ترقی کا پیشہ بتاتی ہے۔ اس میں اُن طریق کی تعلیم دی گئی ہے جن کے ذریعہ سے انسان میں راستی کی عادت اور بُرائی سے پرہیز کی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں چند رسوم اور تیوہاروں کی پابندی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اور یہی حکم آخری عہد کی دیگر تصانیف کا باعث ہوا کیونکہ اس وقت لوگ حضرت زرتشت کی اصلی تعلیم کو فراموش کر چکے تھے اور مراسم میں افراط و تفریط سے کام لینے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسا کہ راگزن لکھتے ہیں[2]: "ان عہد اوستا کے کتب میں تعلیم زردشت کا اصل جوہر ضرور موجود ہے کیونکہ مذہبی پیشواؤں کے لغو احکام میں کچھ نہ کچھ حقانیت ضرور نظر آتی ہے"۔

---

[1] دین ایرانیان - خزینۂ مغ مصنفہ مولٹن صفحہ ۶۵ — [2] میڈیا صفحات ۱۴ - ۱۱۴ -

وحسندیداد کا اصل زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن اس ترجمہ کو بہت سے زرتشتی علماء نے مشتبہ قرار دیا ہے اور اُن کا خیال ہے کہ محض جرمن مترجمین قابل وثوق ہیں۔ لوگ یہ ثابت کرتے ہیں کہ ڈرمیسٹیٹر نے زند اوستا کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اغلاط سے بھرا ہوا ہے اور اکثر مقامات پر ترجمہ اصل سے بالکل مختلف ہے۔ مسٹر گشتاسپ کے۔ نریمان، ڈاکٹر ٹائل کی کتاب "مذہب ایرانیان" کے ترجمہ کے دیباچہ میں اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر ٹائل کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

"جب تم ترجمہ ڈرمیسٹیٹر سے کوئی ٹکڑا نقل کرنا چاہو تو میرے اُن ترمیمات کا ضرور خیال رکھو جو میں نے اس سلسلہ میں کئے ہیں۔ کیونکہ میرے خیال میں اکثر مقامات پر ترجمہ ڈرمیسٹیٹر ناقابل وثوق ہے۔ اگرچہ آج کوئی عالم ایسا نہیں ہے جو ڈرمیسٹیٹر کی طرح اوستا کا ماہر ہو لیکن اُس کا اصول ترجمہ ہی کچھ ایسا تھا جس نے اس کو برباد اور ناقابل وثوق کر دیا ہے۔"

لیکن فی الحال ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس "ناقابل وثوق" ترجمہ ہی کو سامنے رکھیں۔ ہم علمائے یورپ کی جانفشانیوں کے ممنون ہیں کہ انھوں نے زرتشتی کتابوں کو جہاں تک ممکن ہو سکا اُن کی اصلی صورت اور حالت میں منظر عام پر لائے، ہر چند یہ امر تقریباً ناممکن ہے کہ ایک ایسی قدیم زبان کی کتابوں کا ترجمہ ایسی حالت میں جبکہ زبان سیکڑوں سالوں سے مردہ اور غیر مستعمل ہو بالکل صحیح ہو سکے۔ صحیح ترجمہ کیلئے لازمی ہے کہ مترجم ویدک سنسکرت سے، زند و پہلوی تفاسیر سے اور جہاں تک اصلی اوستا کا تعلق ہے علم السنہ سے مقابلتہً بخوبی واقف ہو۔

بہرحال بحث کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ہمیں "یسنا" کی طرف متوجہ ہونا چاہئے یسنا میں ۷۲ ابواب ہیں۔ اس کی تحریر اوستا اور گاتھا دونوں زبانوں میں ہے۔ حقیقتاً یہ کتاب نماز اور عبادات کے متعلق ہے۔ اُن ابواب میں جو زبان گاتھا میں لکھے ہوئے ہیں حمد اور قصاید پر مبنی ہیں۔ ان میں مذہبی نکات اور مسائل پر فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں مقررہ اُصول عبادت سے بحث کی گئی ہے۔ گاتھا تعلیم زرتشتی کا ما حصل اور اصل جوہر ہے۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ حضرت زرتشت کے اصل اور بجنسہ الفاظ و کلمات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے اس حصہ کو بہت زیادہ اہمیت دیجاتی ہے ہم نے کسی اور مقام پر گاتھا کا کچھ ترجمہ درج کیا ہے اور زرتشتی تعلیم کی اصل غرض سے بحث کی ہے۔

"یسنا" کا تذکرہ کر لینے کے بعد تیسری کتاب وسپیارد کا کچھ تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کتاب میں ۲۴ ابواب ہیں۔ یہ حمد اور مناجاتوں کا مجموعہ ہے جو مخصوص تیوہاروں کے موقعوں پر مذہبی پیشواؤں اور مقدس نفوس کو مخاطب کرتے ہوئے ورد کئے جاتے ہیں۔ ان کے ورد سے اہورا مزدا کی اعانت اور رحمت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کتاب میں وہ اجزا بھی شامل ہیں جو یسنا میں اضافہ کئے گئے ہیں۔ اور اس کے اکثر ابواب یسنا کے چند حصوں سے متعلق ہیں اور اُن کے مضامین کی تکمیل کرتے ہیں[1]۔

---

[1] ادبیات مقدسۂ مشرقی جلد ۲۳ صفحہ ۳۳۵۔

اس سلسلہ کی چوتھی کتاب خور داوستا ہے جو ژند اوستا سے مختلف ہے۔ اس مخصوص کتاب میں مندرجہ ذیل صحائف ہیں

یشتہا، نیایشہا، آفرین کانغا اور گاہا مع چند متفرق ٹکڑوں کے۔

یشتہا میں عبادت و ادعیہ اور دیگر اعمال عبادت کی ادائی کے متعلق طریقے مندرج ہیں۔ اس میں علاوہ اہورامزدا کے چند دیگر موجودات کی پرستش کا بھی ذکر ہے لیکن ہم آئندہ ابواب میں ثابت کریں گے کہ یہ بعد کے لوگوں کا اضافہ اور اُن کی من گھڑت باتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی زندگی میں جو کچھ آمیزشیں ہوئی ہیں اُن کا حوالہ دیکر یہ امر اچھی طرح واضح کردیں گے کہ پارسیوں کی یہ خامی چنداں قابل گرفت نہیں ہے عیسائی تو جناب مسیح کی پرستش کرنے لگے اور مسلمان جنھیں پیدا ہوے ابھی تیرہ سو سال ہی ہوئے ہیں اولیا اور صوفیوں کا احترام پرستش کی حد تک نہ محض اُن کی زندگی میں بلکہ بعد مرنے کے کرتے رہتے ہیں۔ پارسیوں کی مذہبی تواریخ کو جن حادثات کا مقابلہ اور سامنا کرنا پڑا ہے اُس کا خیال رکھتے ہوئے یہ اضافہ اور افراط و تفریط کچھ حیرت انگیز نہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں پارسیوں کے مذہبی ادبیات کے انگریزی تراجم کی کمزوریوں کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ ان میں جہاں کہیں بھی فرشتوں اور دیگر اولیاؤں کے احترام و تقدیس کا ذکر ہے اور جہاں کہیں بھی عبادت خداوند عالم کا ذکر ہے ہر جگہ یکساں لفظ پرستش استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہی غلط تراجم بہت حد تک بدگمانی کا باعث ہوئے ہیں۔ کیونکہ لفظ "پرستش" عام ہے جب خدا کے لئے اس کا استعمال کیا جائیگا تو اس کے معنی عبادت ہوں گے اور جب اولیا یا فرشتہ کے لئے استعمال کیا جائے گا تو یقیناً اس کے معنی احترام اور تقدیس کے ہونگے یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہئے کہ مذہب زرتشت کے نزدیک خداوند عالم اور اُس کی برگزیدہ مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پارسی بھی خدا اور اُس کے برگزیدہ بندوں کے درمیان اتنا ہی فرق کرتے ہیں جتنا دیگر اہل کتاب اس مسئلہ اور نکتہ پر پروفیسر مولٹن نے اپنی ایک تصنیف میں بڑی خوبی سے بحث کی ہے۔[۱]

اب ہمیں "گاہا" کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اس میں زرتشتی مذہب نے اپنے پیروں کو شب و روز میں بہ اوقات مختلف پانچ وقت نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس پارسیوں کی نماز پنجگانہ نے مسلمانوں کی تعداد و اوقات نماز پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے اور اسکی طرف پروفیسر ڈرمیسٹیٹر اور گولڈزیہر نے بھی اشارہ کیا ہے۔[۲] گولڈزیہر لکھتے ہیں:-

"مسلمانوں کی نماز جو یہود و نصاریٰ کے اثر سے وقوع میں آئی بلحاظ تعداد ایرانیوں کے اثر سے ظہور پذیر ہوئی نماز جس کی بنیاد خود حضرت محمد نے ڈالی تھی اصل میں دو وقت تھی پھر بعد کو ۳ وقت کردی گئی۔ جیسا کہ خود قرآن میں اُسے "الوسطیٰ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔"[۳]

---

[۱] خزینۂ مغ صفحہ ۱۰۰ — [۲] ملاحظہ ہو "اسلام پر دین مجوس کا اثر" مرقومہ پروفیسر گولڈزیہر منقولہ جی۔ کے نریمان بہ کتاب "ایران و پارسیان" پروفیسر آرنلڈ کی "تعلیمات اسلام" بھی اس سلسلہ میں قابل مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں اُن اسلامی عقاید سے جو پارسیوں سے ملتے جلتے ہیں بڑی خوبی و صفائی سے بحث کی ہے — [۳] مشکوٰۃ المصابیح جلد کتاب ۴ باب نماز

زمانۂ حال کے ایک فاضل مسٹر صلاح الدین خدا بخش نے بھی چند روز ہوئے اس خیال سے ہمخیالی کا اظہار کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

"پارسیوں کے پنجگانے نے جو اُن کی پانچ وقتہ نماز ہے اسلام کے لئے نمونہ کا کام کیا اور اسلام نے جو پارسیوں سے پیچھے رہنا پسند نہ کرتا تھا ۳ وقت سے بڑھا کر پانچ وقتہ نماز کا حکم دیدیا۔"[1]

یہ امر زرتشت کی پیغمبری اور اُن کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے۔ خود قرآن حکیم کا قول ہے:۔

"کوئی رسول کسی نئے مذہب کو پھیلانے نہیں آیا بلکہ پیغمبران سابق کی تعلیم کو زندہ اور اُسکا اعادہ کرنے آیا۔"[2]

"نیایشہا"، نفل اور مستحب نمازیں ہیں۔ ان کی تعداد بھی پانچ ہے۔ ان نمازوں کے ذریعہ پارسی خدا کے دربار میں اُس کے پانچ اعلیٰ مظاہر یعنی آفتاب۔ ماہتاب۔ آب۔ آتش اور روشنی کے عوض شکرانہ ادا کرتے ہیں۔[3]

افرنگان اُس نماز کو کہتے ہیں جو تیوہاروں کے موقع پر ادا کی جاتی ہے۔ اور مخصوص مواقع پر پیشوایان مذہب و دیگر مردہ اشخاص کی ارواح کی یاد تازہ کرنے یا موکل فرشتوں سے امداد طلب کرنے کے لئے ادا کرتے ہیں۔[4]

اب تک جو کچھ ذکر ہوا وہ دور آخر کے عہد اوستا کے مقدس ادبیات کے متعلق تھا۔[5] اب ہمیں زرتشتیوں کے پہلوی کتب سے بحث کرنی چاہئے۔ جہاں تک مذہبی روایات اور مذہبی مراسم و عادات کا تعلق ہے یہ کتب پہلوی بے حد مفید ہیں۔ وقتاً فوقتاً اضافہ کے باعث پہلوی ادبیات کا ذخیرہ بہت بڑا ہے۔ "کارکا" کی تاریخ پارسیان کے مطابق پہلوی تالیفات و تصانیف کی فہرست ۵۲ جلدوں میں ہیں۔ فی الحال ہم چند مشہور اور ضروری پہلوی کتابوں سے بحث کریں گے اور اُن کے مطالب بیان کریں گے۔

(۱) پہلوی زبان کی سب سے مقدس ترین کتاب "دینکارد" ہے اس میں تواریخ۔ نجوم اور مذہب کے اہم مسائل سے بحث کیگئی ہے۔ اور اوستا کے ۲۲ نسخے کی شرح بھی بیان کی گئی ہے۔

(۲) "نیرنگستان"۔ اس کتاب میں ان مذہبی مراسم و تیوہاروں سے بحث کی گئی ہے جو دین زرتشت میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

(۳) "شایست لاشایست" اُن اشیاء کا بیان ہے جو اس مذہب میں حلال و حرام ہیں۔

(۴) "دادستان دینی"۔ اس کتاب میں وہ فتاوے ہیں جو ایک زبردست مجتہد دین زرتشت نے عام طور پر مذہب اور دیگر مراسم دینی کے متعلق وقتاً فوقتاً دئے تھے۔ اس کتاب میں قوانین نکاح و وراثت سے بھی بحث کی گئی ہے۔

(۵) "شکن گمانی وبجار" اس میں خداوند عالم کے وجود پر دھریوں کے مقابلہ میں دلائل و براہین پیش کئے ہیں۔

(۶) "بوندہشنی" اس کتاب کا اہمیت کے اعتبار سے "دنکارد" کے بعد دوسرا درجہ ہے۔ اس میں پارسیوں کے مذہبی اصول

---

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ اسٹیٹسمین ۱۶ ستمبر ۱۹۲۶ء کلکتہ۔ [2] سورہ ۵۰ آیت ۲۷۔ [3] تاریخ پارسیان۔ تاریخ ایران مصنفہ مارخم اور شرح مذہب زرتشت۔ [4] تاریخ پارسیان جلد دوم۔ [5] تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۱۰۱۔۹۵۔

"دری" سے بحث کی گئی ہے اور تمام مخلوق پر نیکی و بدی کے اثرات کو بوضاحت بیان کیا گیا ہے۔

(۷) "مینوخرد" اس میں روایات و اخلاقیات دین زرتشت کی شرح بیان کی گئی ہے۔

(۸) "ماد یگان گشتنو یان" اس میں اسرار الٰہی اور تصوف کے مسائل کو حل کیا گیا ہے۔

(۹) "ماد یگان ویراف" یا "ارداویراف نامہ" اس میں ارداویراف کے بہشت و دوزخ کے خواب کا بیان ہے ارداویراف دین زرتشت کے ایک مشہور ولی اللہ تھے۔ انھوں نے اپنی روحانی قوت سے خواب میں اُن مقامات کو ملاحظہ کیا جہاں نیک اور بد بندے بعد مرنے کے رکھے جائیں گے۔ اس مخصوص خواب کی غرض اصل حالات بہشت و دوزخ سے مطلع کرنا اور اُن افواہ کو دور کرنا تھا جو اس وقت عام لوگوں میں ان مقامات کے متعلق مشہور تھیں۔

(۱۰) "ماد یگان یکیم" مہینہ کے تیسوں دنوں میں سے ہر روز کے الگ الگ فضائل کو بیان کیا گیا ہے جو روز جس کام کیلئے مسعود اور مخصوص ہے بیان کیا گیا ہے۔

بقیہ ادبیات پہلوی میں یا تو ادبیات اوستا کے تراجم و شرح ہیں یا چند متفرق مسائل مذہبی سے بحث کی گئی ہے[۱]۔ ان کتابوں کے علاوہ چند کتابیں "پازند" میں چند فارسی تحریروں کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ فارسی روایات" دورِ آخر کی سب سے معروف اور معزز کتاب ہے۔ اس کی تالیف ہندوستان میں پارسیوں کے بس جانے کے بعد ہوئی۔ اس کتاب میں اُن سوالات کے جواب درج ہیں جو پارسی مقیمان ہندوستان نے اپنے ہم مذہب ایرانی بھائیوں سے چند نکات مذہبی کو حل کرنے کی غرض سے ایران بھیجے تھے۔ اس سلسلہ میں اُن خدمات کا ذکر جو مسلمانوں نے زرتشتی ادبیات کو جمع کرنے اور ترجمہ کرنے میں انجام دی ہیں لازمی ہے۔ عربوں کو ایران کے قرب و جوار میں رہنے کے باعث زرتشتیوں کے متعلق مکمل واقفیت رکھنا آسان تھا بلاشبہ اس کی کاوش میں انھوں نے کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ اسلامی دورِ اول کے خلفاء کو اُن کے زرتشتی مصاحبین نے دین زرتشت کے مذہبی ادبیات کے متعلق اطلاعات پہونچانے میں ہر ممکن طریقے سے مدد دی۔ مسلمانوں کو اقوام اور ملل کی تواریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے لہٰذا انھوں نے فارسی علم ادب کے اس مخصوص شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس مخصوص مضمون پر اصل زبان سے تقریباً تمام کتب عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ اس کی تفصیل کے لئے تصنیفات ابن ندیم۔ حمزہ اصفہانی۔ البیرونی۔ مسعودی۔ طبری وغیرہ کا مطالعہ ناظرین کو کرنا چاہئے۔ اوستا اور اسکے زند پازند تفاسیر کا جہاں تک تعلق ہے ان مصنفوں نے ملک کے چپہ چپہ سے مخطوطات کو جمع کر کے اُن پر بالتفصیل بحث کی۔ اوستا کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور حمزہ اصفہانی نے اکثر مقامات پر اُس کی عبارت نقل کی ہے[۲]۔ اس کے علاوہ پہلوی زبان کی تمام کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

(باقی)

پروفیسر طاہر رضوی، ایم۔ اے　　مترجم سید وجاہت حسنین، ایم۔ اے

---

[۱] زیادہ تفصیل کے لئے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحات ۹۰-۱۰۳ ملاحظہ ہو۔ [۲] الفہرست صفحات ۵-۲۴۴ کتاب التنبیہ الاشراف صفحات ۹۰-۹۲ الملل والنحل صفحات ۱۸۵-۱۹۲ ابن الاثیر جلد اول صفحہ ۱۱۰ دنیاوری صفحہ ۲۶ وغیرہ۔

ستارہ

میرے چھوٹے بھائی بہن میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہیں، میں اُن سے بے حد محبت کرتا ہوں، زیادہ مدت تک اُن سے جدا نہیں رہ سکتا، اُن کی خاطر ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنا کاروبار چھوڑ کر وطن جاتا ہوں اور اُن کی معصوم محبت سے دل کی پیاس بجھاتا ہوں۔

پچھلی دفعہ جب میں وطن گیا تو صبح چار بجے، سورج نکلنے سے پہلے گھر پہونچ گیا۔ امّی جان کے سوا سب سو رہے تھے لیکن جوں جوں صبح ہوتی گئی سب یکے بعد دیگرے جاگتے گئے اور اسلام کر کر کے میرے گرد جمع ہوتے گئے۔ آخر میں سب سے چھوٹی بچی سلیمہ رہ گئی۔ جمیل میاں نے اُس کو جگایا اور کہا کہ بڑے بھائی آئے ہیں اُٹھو! اُس نے اُٹھکر آنکھیں ملتے ہوئے مجھے دیکھا اور جلدی سے منہ چھپا لیا، بڑی مشکل سے اُسکا حجاب دور ہوا اور بالآخر وہ بھی میری گود میں آکر بیٹھ گئی۔

جب دن اچھی طرح نکل آیا تو ان سب کی توجہ کا مرکز میرا سوٹ کیس بن گیا۔ وہ جانتے تھے کہ بڑے بھائی ہمارے لئے سوغات لائے ہوں گے۔ چنانچہ بکس کھولنے کی فرمایش کی گئی۔ اور جب وہ کھُلا تو سب بُری طرح اُس پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کی چیزوں کے علاوہ میں بہت سی مفید و غیر مفید اشیا جن میں بڑا حصہ کھلونوں کا تھا، اُن کے واسطے لایا تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ چیزیں میں اُن میں تقسیم کرتا وہ خود اپنا اپنا حصہ بانٹنے لگے اور مختلف چیزوں پر قبضہ پانے کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔

جس وقت میرا سوٹ کیس اس طرح تاراج ہو رہا تھا میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کمرے کے دروازے سے لگی ہوئی ہم سب سے چار پانچ قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اُس کی عمر چھ سات سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بھولی بھالی شکل، سانولی رنگت، اُلجھے ہوئے بال، کپڑے میلے اور دیہاتی قسم کے، اُس کی ہئیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آس پاس کے کسی گھر سے تعلق رکھتی ہے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے آگئی ہے۔ وہ اس لوٹ مار کے منظر کو بہت انہماک کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کی خفیف مسکراہٹ سے اور آنکھوں کی چمک سے اُس کی دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ یہ لڑکی میری موجودگی کے باعث قریب آنے میں جھجکتی ہے اُس کو اپنے پاس بلایا اور بکس میں سے ایک کھلونا دیا جس کو اُس نے بغیر تامل کے قبول کر لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس جذبے سے متاثر ہو کر میں نے اس لڑکی پر عنایت اور توجہ صرف کی ہے وہ بہت جلد میرے لئے ایک عذاب جان بن جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد جب یہ لوٹ مار ختم ہو گئی اور بچے مجھے اور میرے سوٹ کیس کو بھول کر اپنے کھیلوں میں معروف ہو گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی صحن میں جھاڑو دے رہی ہے اور ساتھ ساتھ امّی جان کے بعض احکام کی بھی تعمیل کرتی جا رہی ہے۔ مثلاً "ستارہ! لیجیو یہ دودھ کی پیالی سلیمہ کو دیدے"۔ "دیکھ بلّی اندر گئی ہے اُس کو وہاں سے بھگا"۔ "کوٹھے پر دیکھ خانم کیا کر رہی ہے، کچھ کام نہ کر رہی ہو تو کہنا امّی بلا رہی ہیں"۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ امّی جان نے اس لڑکی کو نوکر رکھ لیا ہے۔ کسی نہایت حقیر معاوضے پر اُسکی خدمات حاصل

کرلی ہیں۔ پھر امی جان نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی کے ماں باپ مرچکے ہیں۔ اور اب یہ اپنے چچا کے ہاں رہتی ہے۔ اس کی چچی اس سے بہت محبت کرتی ہے لیکن ان بیچاروں کی مالی حالت ایسی نازک ہے کہ وہ اس کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھلا سکتے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کم از کم بھوکی تو نہ رہے گی انھوں نے اسکو ہمارے ہاں ملازم کرادیا ہے۔

ہندوستان میں اس نوع کے یتیم بچوں کی کمی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی بہت سی لڑکیوں کو دیکھا تھا اس سے بدتر حالت میں دیکھا تھا۔ بھیک مانگتے ہوئے اور فاقہ کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن جسقدر اثر میں نے اس لڑکی سے لیا کسی سے نہیں لیا۔ اسکا سبب شاید یہی تھا کہ وہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی تھی میں اسکو اور اسکی مظلومیت کو ہر وقت دیکھتا تھا اور ہر وقت دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔

میں دیکھتا تھا کہ وہ جھاڑو دے رہی ہے اور اگر جھاڑو دیتے دیتے کسی کھیل میں لگ گئی تو امی جان نے جھڑک دیا ہے اور غریب پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی ہے۔ یا پھر باورچی خانے میں بیٹھی برتن مانجھ رہی ہے۔ اُس کا چھ سات برس کا ننھا سا وجود بڑے بڑے برتنوں سے گھرا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ بھر کی مظلومیت اور ستم زدگی اسی ننھے سے وجود میں سمٹ کر آگئی ہے۔ اُسکے ماں باپ اپنی زندگی کے تمام آلام اور ساری مشقتیں اُسی کو سونپ گئے ہیں۔ اور آج جبکہ اس کو کھیل کود اور دوسرے بے معنی مشاغل میں وقت ضائع کرنا چاہیے تھا وہ محنت کر رہی ہے اور اپنی محنت و مزدوری سے اپنا پیٹ پال رہی ہے۔ اگر وہ کام نہ کرے، جھاڑو نہ دے برتن نہ مانجھے، سلیمہ کو دودھ کی پیالی نہ دے، چھت پر جاکر خانم کو نہ بلائے، اور صبح سے شام تک ہزاروں احکام کی تعمیل نہ کرے تو وہ بھوکی رہ جائے گی، اُسے کھانے کو سوکھے ٹکڑے بھی میسر نہ آئیں گے۔ اور یہ سب کس لئے؟ صرف اس لئے کہ اُس کے سرپرست مفلس و نادار ہیں اور اُس کے ماں باپ مرچکے ہیں!!

میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک معصوم طفلانہ مسکراہٹ کھیلتی ہے لیکن اُس کی آنکھوں سے ایک ایسی بے چارگی اور غمگینی ٹپکتی ہے کہ دیکھنے والے کا دل کیفیات غم سے لبریز ہوجاتا ہے، جی زندگی سے بیزار ہوجاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پُراسرار طریقے پر دنیا کے سارے مظلوموں کی فریادیں انھیں دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آکر جمع ہوگئی ہیں، کائنات کی تمام دردمندیاں انھیں میں کھنچ آئی ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں کڑھتا تھا کسی سے کہہ نہ سکتا تھا۔ کہنے کی بات ہی نہ تھی۔ کون میری باتوں پر کان دھرتا۔ سب یہی کہتے کہ میاں دیوانے ہو، ذرا سی بات ہے اُس کو افسانہ بنائے دیتے ہو، دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے، کوئی امیر کوئی غریب ایسا نہ ہو تو دنیا کا کام کیونکر چلے۔

غرض اس لڑکی سے متعلق جو میرے جذبات تھے اُن سے دنیا واقف نہ تھی۔ اور اگرچہ وہ لڑکی بھی دوسروں کی طرح کچھ نہ جانتی تھی اور نہ جان سکتی تھی، تاہم میں سمجھتا ہوں اُس کو میری ہمدردی کا ایک غیر شعوری احساس ضرور تھا۔ ایک شیرخوار بچہ بھی دست شفقت کو پہچانتا ہے اور محبت بھری آواز کو سن کر مسرور ہوتا ہے۔ وہ تو پھر ایک سمجھدار لڑکی تھی، عقل اور شعور رکھتی تھی، میری ہمدردیوں سے کس طرح بے خبر رہتی۔ میں اُس کو کبھی جھڑکتا نہیں تھا اور جب اُس سے بات کرتا تھا تو میرے لہجہ میں ایک ایسی نرمی اور محبت ہوتی تھی

جس کو وہ کہیں اور نہ پا سکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب اُس کو میرے متعلق کوئی خدمت انجام دینی ہوتی تو وہ بڑی سرگرمی کا اظہار کرتی۔ بلکہ اکثر دوپہر کے وقت جب وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو جاتی تو نہایت خاموشی کے ساتھ میرے کمرے میں آکر کھڑی ہو جاتی اور دل ہی دل میں توقع کرتی کہ میں کوئی خدمت اُس کے سپرد کروں گا۔ میں اُس کا مدعا سمجھ جاتا۔ مجھے بے حد تکلیف ہوتی (جس دردناک منظر کو خیال برداشت نہیں کر سکتا اُس کو آنکھیں زیادہ دیر تک کیونکر دیکھ سکتی ہیں؟) اور میں خواہ مخواہ اُس سے کسی کام کے لئے کہتا مثلاً پینے کے لئے پانی منگاتا۔ وہ بہت خوش ہو کر پانی لاتی لیکن اُس کے بعد بھی بدستور اپنی جگہ میرے احکام کی منتظر رہتی۔ پھر میں اُس سے باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ "ستارہ تم کچھ پڑھتی پڑھاتی نہیں ہو؟" شاید یہ میرا پہلا سوال ہوتا۔ اُس کے جواب میں وہ کہتی "اگلے سال میں مولوی صاحب کے مدرسہ میں پڑھنے جاتی تھی، وہ مجھے قاعدہ پڑھاتے تھے، پھر اماں مر گئیں اور میں یہاں آگئی، بڑے بھائی وہ کتاب میرے پاس رکھی ہے، تم پڑھا دیا کرو، میں امی جان سے پوچھ لوں گی۔" "ہاں میں تم کو پڑھا دوں گا" میں جلدی سے جواب دیتا "لیکن ستارہ! تم اپنی اماں کو بھی کبھی یاد کرتی ہو؟" وہ اس پر کچھ شرما سی جاتی اور نگاہیں نیچی کر لیتی۔ کچھ کہنا چاہتی لیکن نہ کہہ سکتی۔ اس کے بعد اُس کے باپ کا ذکر آتا۔ باپ کے متعلق وہ اور بھی کم جانتی تھی۔ اُسے مرے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اُس کے دماغ میں صرف چند واقعات کے دھندلے نقوش تھے۔ اور وہ انہی واقعات کو مختصر الفاظ میں دُہراتی۔ پھر اُس کے چچا اور چچی کے متعلق گفتگو ہوتی۔ اُس کی چچی اُس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اکثر اُس کے ماں باپ کو یاد کر کے اُسی کے سامنے رویا کرتی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے ستارہ کو اپنے بدقسمت اور کم نصیب ہونے کا احساس بھی تھا اور اُس کی آنکھوں میں رنج والم کی کیفیات اسقدر نمایاں تھیں۔ ان باتوں میں بہت کافی وقت گزر جاتا یہاں تک کہ اندر سے "ستارہ، اری ستارہ" کی آوازیں آتیں اور وہ اپنے کام میں مصروف ہونے کے لئے چلی جاتی۔

اس مرتبہ مجھے چند اسباب کی بنا پر بہت دنوں وطن میں رہنا پڑا لیکن اس تمام مدت میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب ستارہ کے خیال نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہو۔ اُس کا وجود میری جان کے لئے ایک روگ ہو گیا تھا، ایک مستقل عذاب بن گیا تھا۔ میں کچھ کام کر رہا ہوتا یا کسی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوتا اور سامنے سے ستارہ آجاتی — صرف اُس کا خیال آجاتا — تو تھوڑی دیر کے لئے دُنیا نظروں میں تاریک ہو جاتی، اور ہر چیز نفرت انگیز اور بیزار کن معلوم ہوتی۔ میں دل میں غور کرتا کہ آخر یہ کیوں ہے؟ اس جذبات پرستی کا کیا سبب ہے؟ اس لڑکی سے میں کیوں اسقدر متاثر ہوتا ہوں؟ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ صرف یہی خیال ہوتا کہ چونکہ بچوں کو میری زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے اور بچوں کے معاملے میں میں بہت حساس ہوں اس لئے ستارہ کی شخصیت سے بہت زیادہ اثر قبول کرتا ہوں۔ بسا اوقات میں اپنے آپ کو سمجھانے کی بھی کوشش کرتا کہ آخر ستارہ ایسی بھی کیا مصیبت زدہ لڑکی ہے کہ میں اُس کے باعث اپنی زندگی کو بے مزہ کر ڈالوں۔ وہ ہنسی خوشی رہتی ہے اور بے فکری کے ساتھ اپنے دن گزارتی ہے۔ مجھے اُس کے غریب ہونے اور ایک خادمہ کی طرح کام کرنے کا اتنا خیال نہ کرنا چاہئے۔ لیکن پھر مجھے وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یاد آجاتیں اور وہ آنکھیں میرے سامنے ایک نئی دنیا پیش کر دیتیں۔ اس دنیا میں بہت سی لڑکیاں، کم عمر، کم نصیب اور شکستہ حال لڑکیاں، جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے میں مشغول ہوتیں۔ میں اس نظارے کی تاب نہ لا کر پریشان ہو جاتا اور سراسیمگی کے عالم میں خوفناک خیالات کو اپنے دماغ میں پناہ دینے لگتا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور ستارہ کے معاملہ میں میری ذکاوت حس زیادہ ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک صبح جب میں سو کر اُٹھا تو چند آہنی ارادے میرے ساتھ تھے۔ یہ ارادے گزشتہ شب کے غور و فکر کا نتیجہ تھے۔ اور ان کو پورا کرنے کے لئے میں اپنی کوششیں فوراً اُسی صبح شروع کر دینا چاہتا تھا۔ ستارہ عام طور پر بہت سویرے، میرے ناشتے سے پہلے ہی آجاتی تھی۔ کیونکہ اُس کا گھر زیادہ دور نہ تھا، مشکل سے سو قدم کے فاصلے پر ہوگا۔ لیکن اُس روز میں ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بھی چلا گیا اور ستارہ نہ پہونچی۔ تھوڑی دیر میں امی جان کو بھی تشویش ہوئی اور انھوں نے ماما کو اُس کے گھر بھیجا کہ جا کر دیکھے اور اُس کے نہ آنے کا سبب معلوم کرے۔ ماما اُلٹے پاؤں واپس آئی اور اُس کی چچی کی طرف سے یہ جواب لائی کہ "ہمارے عزیز و اقارب اس بات کو بہت معیوب سمجھتے ہیں کہ لڑکی ملازمت کرے۔ اور اُن کے اعتراض کی وجہ سے اب ہم ستارہ کو نہ بھیجیں گے۔"

میں ماما کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اپنے کمرے میں سُن رہا تھا جب میں اُن کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تو اس علم کے باوجود کہ اب ستارہ کو پیٹ بھر کر دیکھنے کی بھی بمشکل سے ملیگی، مجھے ایک قسم کا اطمینان حاصل ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ دل میں بہت دنوں سے ایک کانٹا چبھا ہوا تھا، وہ کسی نے نکال لیا اور خلش کی بجائے سکون میسر ہوگیا۔

اختر انصاری

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸؍ کے مجلد کتاب صرف عہ میں اور غیر مجلد عا میں ملیگی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ہے میں اور غیر مجلد ہے میں علاوہ محصول ۸؍ کے ملیگی۔

اگر

ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۳۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

مصطفےٰ کمال پاشا کی ابتدائی زندگی

اس سے قبل (یعنی نومبر سنہ ۳۴ء سے مارچ سنہ ۳۵ء تک) مصطفےٰ کمال کے وہ حالات درج ہو چکے ہیں جن کا تعلق اس کے ورود قسطنطنیہ سے لیکر زمانہ حال تک ہے، لیکن تصویر کا مکمل خاکہ اسوقت تک سامنے نہیں آسکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اس "بطلِ اعظم" کی ابتدائی زندگی کس طرح بسر ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ کن حالات کے ماتحت اس نے ترقی کر کے یہ مرتبہ حاصل کیا۔

اس وقت تک ہم نے اس مسئلہ پر بھی روشنی نہیں ڈالی کہ انور پاشا وغیرہ دیگر اکابر ترکی سے مصطفےٰ کمال کے تعلقات کیا تھے، ان میں باہم کر کیا اختلاف تھا اور نیز یہ کہ جنگ عظیم کے دوران میں اس نے کتنی اہم خدمات ملک و وطن کی انجام دیں۔ بہرحال اب یہ حصہ بھی پیش کیا جاتا ہے امید ہے کہ دو یا تین اشاعتوں میں مکمل ہو جائے گا اور اس طرح مصطفےٰ کمال کی مکمل سیرت ناظرین نگار کے سامنے آجائے گی۔

نیاز

مصطفےٰ کمال کے باپ کا نام علی رضا اور ماں کا زبیدہ تھا۔ ان کا وطن سالونیکا تھا۔ علی رضا فی الاصل رہنے والا تو البانیہ کے پہاڑی علاقہ کا تھا، لیکن کمسنی میں یہاں آگیا تھا اور یہیں بعد کو سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔

چونکہ تنخواہ کم تھی اور وہ بھی حکومت کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے مہینوں نہیں ملتی تھی اس لئے دفتر کے علاوہ فرصت کے اوقات میں وہ چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت بھی کیا کرتا تھا۔۔۔ زبیدہ مصطفےٰ کمال کی ماں بھی خالص ترکی نسل کی تھی اور حسب رواج پردہ کی پابند تھی اور تعلیم سے بالکل بے بہرہ۔ اس کا باپ جنوبی البانیہ کا رہنے والا تھا اور ماں مقدونیہ کی۔۔۔ زبیدہ دراز قامت، صحیح و توانا، نیلگوں آنکھوں والی عورت تھی اور باوصف غیر تعلیم یافتہ ہونے کے بہت ذہین تھی۔

اسوقت ملک کی سیاسی و اقتصادی حالت یہ تھی کہ عیسائی حکومتیں چاروں طرف سے ترکی پر دانت لگائے ہوئے تھیں اور ان میں سے ہر ایک اس فکر میں تھی کہ کوئی ٹکڑا اس کا غصب کرلے، روس کریمیا اور قاف پر قابض ہو چکا تھا اور قسطنطنیہ کی فکر میں لگا ہوا تھا، فرانس، شام اور ٹیونس پر متصرف تھا اور انگلستان، مصر و قبرص پر۔ جرمنی بھی سلطان عبدالحمید کو شیر جیتا بنا کر دیگر مغربی حکومتوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح اپنے حقوق وہاں پیدا کرے۔۔۔ الغرض جس طرح ایک

لاش کے گرد گدھوں کی ٹکڑی جمع ہو کر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہے، اسی طرح مغربی حکومتیں، ترکی کی ہیجان حالت سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھیں، لیکن چونکہ ان سب کی اغراض میں باہم گر تصادم ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے اس خوف سے کہ مبادا عالمگیر جنگ شروع ہو جائے ہر ایک، مناسب موقعہ کی منتظر تھی۔

آخر کار سنہ ۱۸۷۷ء میں روس نے اس حالت منتظرہ کو دور کرنے کا فیصلہ کر کے جنگ کا اعلان کر دیا اور اپنی فوجیں روانہ کر دیں ظاہر ہے کہ ترکی میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ برسر پیکار ہوتا، عساکر روس بڑھتے رہے یہاں تک کہ قسطنطنیہ دس میل رہگیا۔۔ لیکن اسوقت بھی مغربی حکومتوں کا جذبۂ رشک و رقابت ترکوں کے لئے ابر رحمت بن گیا اور ڈسرائیلی نے برلن کانگریس میں تمام مغربی حکومتوں کو اسبات پر آمادہ کر لیا کہ روس کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے کیونکہ یورپ میں قیام امن و سکون کے لئے ترکی کا وجود ضروری ہے۔

الغرض یہ حالات تھے ترکی کی بیکسی و بے بسی کے کہ سنہ ۱۸۸۱ء میں زبیدہ کے بطن اور علی رضا کے صُلب سے سالونیکا میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے مصطفیٰ رکھا۔

اس سے قبل ایک لڑکا اور پیدا ہو چکا تھا لیکن وہ زندہ نہ رہ سکا، ایک لڑکی ضرور موجود تھی (جس کا نام مقبولہ تھا) لیکن چونکہ لڑکا کوئی نہ تھا اس لئے مصطفیٰ کے پیدا ہونے کی ماں باپ کو بہت خوشی ہوئی اور لاڈ میں ایک بچہ جتنا خراب کیا جا سکتا ہے، اتنا ہی مصطفیٰ کو بھی کیا گیا۔

مصطفیٰ فطرتاً خاموش، کمزور، اور الگ تھلگ رہنے والا لڑکا تھا، جو زردی مایل نیلگوں آنکھیں اور بھورے بال رکھنے والے بچوں کی خصوصیات میں داخل ہیں نہ ماں باپ سے اس کو زیادہ علاقہ تھا نہ ساتھ کے لڑکوں سے، وہ گھر میں بھی ماں باپ سے زیادہ لگا لپٹا نہ رہتا تھا اور باہر بھی جب بچوں میں کھیلتا تھا تو سب سے علٰحدہ۔

علی رضا نے اب دفتر کی نوکری ترک کر دی تھی اور شہتیروں کی تجارت میں لگ گیا تھا، یہ چاہتا تھا کہ مصطفیٰ بھی اسی طرف متوجہ ہو، لیکن زبیدہ اس کو مولوی اور مذہبی آدمی بنانا چاہتی تھی۔

ابتدا میں اس کو محلہ کی مسجد میں پڑھنے کے لئے بھیجا گیا جہاں ابتدائی تعلیم قرآن کی ہوئی اور پھر شمسی آفندی کے مدرسے میں۔ اسی زمانہ میں ناگہاں علی رضا کا انتقال ہو گیا اور چونکہ روپیہ پاس نہ تھا اس لئے زبیدہ اپنے بھائی کے پاس چلی گئی جو سالونیکا سے باہر ایک گاؤں (لنزا سسن) میں کاشتکاری کیا کرتا تھا۔ یہاں پہونچکر مصطفیٰ کو بھی مزارعانہ خدمات سپرد کی گئیں، وہ اصطبل صاف کرتا، بھیڑیں چراتا، کھیتوں کی حفاظت کرتا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان خدمات سے خوش تھا، کیونکہ کھلی ہوئی ہوا میں رہنا، آزادانہ زندگی بسر کرنا اور محنت کے کام کرنا اس کی فطرت تھی۔ وہ یہاں پہونچکر تندرست تو ضرور ہو گیا لیکن اس کی خاموش اور علٰحدگی پسند طبیعت اور زیادہ قوی ہو گئی۔

دو سال کے بعد اس کی ماں نے جو اس کو کاشتکار بنانا پسند نہ کرتی تھی اپنی ایک بہن کی مدد سے اُسے سالونیکا کے ایک مدرسہ

میں داخل کرادیا، لیکن یہاں پہونچکر اس نے اُستادوں اور لڑکوں سے لڑائی شروع کر دی، نہ وہ کسی قاعدہ کی پابندی کرتا تھا، نہ کتابوں کی طرف توجہ کرتا تھا، کھیلتا بھی تھا تو خودرائی کے ساتھ اور جو کوئی لڑکا دخل دیتا تو اس سے لڑتا تھا۔ ایک بار کسی معاملہ میں اُستاد نے اس کو خوب مارا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بگڑکر وہاں سے چلا آیا اور پھر نہ گیا۔

زبیدہ نے اس کو بہت سمجھایا، زجر و توبیخ کی، لیکن وہ ماں کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا اور برابر سے اس کو ہر بات کا جواب سختی سے دیتا تھا۔

آخرکار زبیدہ کے بھائی نے کہا "لڑکا بڑا خود سر ہے یہ پڑھے وڑھے گا نہیں، اس کو سالونیکا کے فوجی اسکول میں بھیجدینا چاہئے، اگر وہاں یہ اہل ثابت ہوا تو فوج میں کوئی عہدہ اس کو مل جائے گا۔ چچا کی یہ تجویز اس کو پسند آئی اور باوجود ماں کی مخالفت کے وہ اسی پر اڑا رہا۔ وہ دوسرے فوجی نوجوانوں کو وردی پہنکر اکڑتے ہوئے دیکھتا تھا تو اس کے دل میں بھی ولولہ پیدا ہوتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ بھی اسی شان سے چلے پھرے اور لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں۔ ایک پنشن یافتہ فوجی افسر اس کے باپ کا دوست تھا۔ یہ اس کے پاس گیا اور اس کی مدد سے فوجی اسکول میں داخل ہو گیا۔

ہرچند اس کی تنک مزاجی و خودسری یہاں بھی وہی تھی، لیکن چونکہ فطرتاً اسے فوج کے کاموں سے دلچسپی تھی اس لئے اس کے ایک اُستاد نے جس کا نام بھی مصطفیٰ تھا، اس کی محنت کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کو کسی چھوٹے درجہ کی تعلیم بھی سپرد کر دی۔ اسی کے ساتھ اس کے نام کے ساتھ لفظ کمال کا بھی اضافہ کر دیا تاکہ اس کے اور مصطفیٰ کے نام میں امتیاز پیدا ہو جائے۔

سترہ سال کی عمر میں جب وہ اس اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوا تو مناستر کے فوجی اسکول میں بھیجدیا گیا۔ مناستر کی حالت اسوقت یہ تھی کہ فوجوں کی آمد و رفت اور توپخانوں کی نقل و حرکت سے ہر وقت ہنگامہ برپا رہتا تھا کیونکہ یونان نے جزیرۂ کریٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور ترکی نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ اندرون ملک کی حالت یہ تھی کہ لوگ سلطان عبدالحمید سے ناخوش تھے کیونکہ وہ جدید اصلاحات کا حامی نہ تھا اور ہزاروں نوجوان ترک قید و بند کی مصیبت میں مبتلا تھے۔ الغرض اندر باہر ہر جگہ بدامنی، بغاوت اور بے اطمینانی نظر آتی تھی۔ مصطفیٰ کمال اب اتنا ذیہوش ہو گیا تھا کہ وہ ان تمام حالات کا مطالعہ کرتا، کسی نتیجہ تک پہونچتا اور چونکہ وہ فطرتاً انقلاب پسند واقع ہوا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ کس نتیجہ پر پہونچا ہو گا۔

وہ تعطیلوں میں سالونیکا چلا جاتا تھا لیکن اپنی ماں سے بہت کم ملتا تھا، کیونکہ اس نے رھوڈس کے کسی تاجر سے شادی کر لی تھی اور مصطفیٰ کمال کو یہ بات کچھ پسند نہ تھی۔ سالونیکا میں اس کی ملاقات ایک دوسرے نوجوان سے ہوگئی جس کا نام فتحی تھا۔ یہ فرانسیسی زبان خوب جانتا تھا اور ان دونوں نے ملکر انقلابی لٹریچر کا مطالعہ شروع کیا۔ والٹیر، روسو، ہابس اور اسٹوارٹ مل کی انقلابی و اقتصادی کتابیں خصوصیت کے ساتھ ان کے پیش نظر تھیں۔

اُس وقت وہاں ان کتابوں کا مطالعہ جرم میں داخل تھا اور جس کے پاس یہ کتابیں پائی جاتی تھیں ان کو قید کر دیا جاتا تھا۔ اس مخالفت نے مصطفیٰ کمال کو اور زیادہ ان کتابوں کی طرف مائل کر دیا تھا۔

مصطفٰے کمال اسی کے ساتھ ساتھ تقریر کرنے کی بھی مشق کرتا جاتا تھا اور سپاہیوں سے یہ خیال ظاہر کرتا رہتا تھا کہ ترکی کو اغیار کے چنگل سے بچانا اور سلطان عبدالحمید کی لعنت سے آزاد کرانا ہر ترک کا فرض ہے۔

جب وہ مناستر کے مدرسہ کی تعلیم ختم کر چکا قسطنطنیہ کے مدرسۂ حربیہ میں (Sub Lieutenant) بناکر مزید تعلیم کے لئے بھیجدیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ یہاں پہونچکر اس نے جلدی جلدی تمام امتحانات میں کامیابی حاصل کی یہاں تک کہ ۱۹۰۵ء میں کپتانی کے عہدہ پر مامور ہوگیا۔

مناستر اور قسطنطنیہ کے حربیہ مدارس میں جن نوجوانوں سے اس کی ملاقات ہوئی، اُن سب کو اس نے انقلاب کا حامی پایا۔ یہاں تک کہ نوجوان افسر بھی اکثر اسی خیال کے تھے۔ بلکہ قسطنطنیہ کالج میں تو ایک انقلابی سوسائٹی وطن کے نام سے قائم بھی تھی۔ اسکے خفیہ جلسوں میں مصطفٰے کمال بھی شریک ہوتا، انقلابی نظمیں لکھتا اور انقلابی تقریریں کرتا۔ اساتذہ بھی اس سے آگاہ تھے لیکن چونکہ دل سے انقلاب کے حامی تھے، اس لئے ہمیشہ ٹال جاتے تھے۔ جب سلطان عبدالحمید کو خبر پہونچی اور اس نے اسماعیل حقی پاشا کو اس سوسائٹی کے استیصال پر مامور کیا تو اس کے جلسے ہونا بند ہوگئے۔ لیکن مصطفٰے کمال نے شہر کی ایک گلی میں مکان کرایہ پر لیکر وہاں خفیہ جلسے کرنا شروع کئے۔ چونکہ مصطفٰے کمال انقلابی لٹریچر کا کافی مطالعہ کر چکا تھا اس لئے اس نے سوسائٹی کے مخصوص قواعد مرتب کئے، خاص نشانات ممبروں کے لئے وضع کئے اور منظم طور پر لوگوں کو اس میں شریک کرنے لگا۔ لیکن دوسری طرف حکومت بھی غافل نہ تھی اور آخر کار ایک دن جبکہ سوسائٹی میں کسی نئے ممبر کو حلف دیا جانے والا تھا، پولیس نے محاصرہ کر کے اس سوسائٹی کے تمام ممبروں کو جن میں مصطفٰے کمال بھی شامل تھا گرفتار کر لیا۔

پولیس کے پاس کافی شہادت اس جماعت کے خلاف موجود تھی اور مصطفٰے کمال کے ختم کرنے کے لئے تو بہت مواد موجود تھا، اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ جس طرح اس سے قبل اور صدہا نوجوان سلطان کے غیظ و غضب کا شکار ہو چکے ہیں، وہ بھی ہو جائیگا اور اسی یقین کے ساتھ وہ قیدخانہ کی اندوہناک زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی ماں بہن نے ملنا چاہا لیکن اجازت نہیں دی گئی۔

ایک دن ناگہاں دو سپاہی آئے اور اسے اسماعیل حقی پاشا کے پاس لے گئے جو قدیم خیال کا ترک افسر تھا۔ اس نے مصطفٰے کمال سے مخاطب ہو کر کہا:-

> "اس میں شک نہیں کہ تم میں کافی اہلیت خدمت وطن کی موجود ہے، لیکن افسوس ہے کہ تم نے اس اہلیت سے اچھا کام نہ لیا، تمہارا فرض تھا کہ سلطان کے مطیع و فرمانبردار رہتے لیکن تم نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ بہر حال سلطان تم پر رحم کرنا چاہتے ہیں اور اس مرتبہ تمہارے قصور کو معاف فرماتے ہیں، تم دمشق پہونچکر رسالہ میں جاکر اپنے عہدہ کا چارج لو اور احتیاط رکھو کہ آئندہ ایسی نازیبا حرکتیں تم سے سرزد نہ ہوں"۔

اسی رات کو مصطفےٰ کمال شام کی طرف جانے والے جہاز پر بٹھا دیا گیا اور ۸۰۰ دن کے بعد دمشق پہونچا یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ رسالہ دروزیوں کے خلاف روانہ ہونے والا ہے - دروزی جنوب دمشق کے پہاڑوں میں آباد تھے اور اکثر بغاوت کیا کرتے تھے مصطفےٰ کمال کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ عملاً کسی جنگ میں حصہ لے لیکن وہ اس موقعہ سے زیادہ خوش اس لئے نہ تھا کہ دروزی کسی جگہ سامنے آکر باقاعدہ جنگ تو نہ کر سکتے تھے بلکہ صرف غارتگرانہ حیثیت سے بدامنی پھیلاتے تھے اور جب فوجوں کو مقابلہ ہوتا تھا تو پہاڑوں میں جاکر چھپ جاتے تھے - اس لئے ترکی فوجوں کا کام صرف یہ تھا کہ انتقام لینے یا درس دینے کے لئے اُن کے غیر آباد گاؤں میں آگ لگادیں یا ان کی کھیتیاں جلادیں -

جب اس مہم سے فارغ ہوکر (جسے جنگ کہنا مناسب نہیں ہے) مصطفےٰ کمال دمشق واپس آیا تو اس نے یہ دیکھ کر کہ یہاں بھی فوجی افسروں کے دل انقلاب کی طرف مایل ہیں اور سلطان عبدالحمید کی حکومت سے سخت بیزار ہیں، انقلابی سوسائٹی کی ایک شاخ قایم کی اور چند دن میں وہ تمام فوج کا منظور نظر ہوگیا - لیکن چونکہ اہلِ دمشق اس تحریک کے مخالف تھے اس لئے وہ انقلاب کی تحریک کو دمشق سے شروع کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا -

اسی زمانہ میں اس کے بعض احباب نے لکھا کہ اصل مرکز بے چینی کا بلقان ہے، اس لئے کوشش کرکے اسے سالونیکا میں آجانا چاہئے - اس نے فوراً چند دن کی رخصت لی اور بندرگاہ یافا پہونچا - یہاں کا کمانڈر احمد بے تھا جو سوسائٹی کا ممبر تھا اس سے تمام گفتگو کرکے مصطفےٰ کمال بہ تبدیل نام ولباس پاسپورٹ حاصل کرکے مصر پہونچا اور وہاں سے ایتھنز ہوتا ہوا سالونیکا میں داخل ہوگیا - یوں تو راستے میں اسے ہر جگہ خفیہ سوسائٹیاں نظر آئیں اور سارے ملک کو موجودہ حکومت سے بیزار پایا، لیکن سالونیکا پہونچکر اسے معلوم ہوا کہ انقلاب کا مرکز اگر کوئی مقام ہوسکتا ہے تو وہ صرف سالونیکا ہے -

سالونیکا میں وہ خفیہ طور پر فوج کے افسروں اور اپنے بعض ساتھیوں سے ملا اور یہ معلوم کرکے اسے اطمینان ہوا کہ سب اس کے ہم خیال ہیں لیکن قبل اس کے کہ کوئی نتیجہ برآمد ہوتا سلطان کے جاسوسوں کو علم ہوگیا اور اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہوگئے - قسطنطنیہ کا اڈجوٹنٹ کمانڈر (جمیل) جو سوسائٹی کا ممبر رہ چکا تھا، اس نے مصطفےٰ کمال کو کہلا بھیجا کہ وہ دو دن احکام گرفتاری کی تعمیل کو ٹالتا رہے گا اور اس دوران میں اس کو روپوش ہوجانا چاہئے - مصطفےٰ کمال فوراً بھاگ کر یافا پہونچا لیکن یہاں اس کی گرفتاری کے احکام پہلے ہی پہونچ چکے تھے - احمد بے جو گرفتاری کے لئے مامور تھا اور جو اس کا دوست تھا اس نے مصطفےٰ کمال کی وردی اس کے سپرد کی اور اسے غازا کی طرف روانہ کردیا جہاں مفید لطفی فوج کا کمانڈر تھا -

ادھر احمد بے نے قسطنطنیہ کو اطلاع دی کہ مصطفےٰ کمال تو اس دوران میں برابر غازا ہی میں رہا ہے اور شام کی حدود کو چھوڑا بھی نہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے - اُدھر مفید لطفی نے بھی تصدیق کردی کہ مصطفےٰ کمال اسی کے پاس غازا میں رہا ہے اور اس طرح خدا خدا کرکے اسکی جان بچی -

اس کے بعد ایک سال تک وہ خاموش رہا اور کوئی موقعہ شکایت کا کسی کو نہیں ملا۔ افسران نے بھی اس کے کام کے متعلق نہایت اچھی رپورٹ دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سالونیکا تبدیل کر دیا گیا جہاں پہونچنے کی اس کو بڑی تمنا تھی۔

سالونیکا میں اس کو اپنے ساتھی بہت سے ملے اور اس نے کوشش کی کہ سوسائٹی کی جدید شاخ یہاں قائم کرے لیکن اس نے محسوس کیا کہ لوگ اُس سے کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہیں اور جب وہ کسی مجمع میں پہونچ جاتا تو لوگ باتیں کرتے رُک جاتے تھے، ان کا خیال تھا کہ مصطفیٰ کمال حکومت کا جاسوس بن گیا ہے۔

ایک دن اس کے کسی دوست نے بیان کیا کہ اس وقت سالونیکا میں انقلابی جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے موجود ہے۔ اس کے ممبران اطالوی فری میسن لاج میں شامل ہو گئے ہیں، کیونکہ از روئے معاہدہ حکومت ترکی اطالوی رعایا کو گرفتار کر سکتی ہے نہ اُن کے گھروں میں جا سکتی ہے اور اس طرح انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں کو وہاں جلسہ کرنے کا پورا موقعہ مل جاتا ہے۔ اسی دوست سے مصطفیٰ کمال کو یہ بھی معلوم ہوا کہ فوج کے اکثر افسران جن میں فتحی بھی شامل ہیں اس انجمن کے ممبر ہو گئے ہیں۔

آخر کار جب مصطفیٰ کمال کی طرف سے جاسوس ہونے کا شبہ زائل ہو گیا تو انجمن نے اس کو بھی ممبر بنا لیا۔ لیکن یہاں کی فضا کو اس نے پسند نہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ لاج حقیقتاً بین الاقوامی نہلسٹوں کا مرکز ہے اور زیادہ تر یہودیوں کے سیاسی مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، خالص ترکی اغراض و مقاصد سے بحث نہیں کی جاتی۔ خود اُسے نہ یہودیوں سے دلچسپی تھی نہ اُن کی بین الاقوامی اہمیت سے۔ وہ ترک تھا اور صرف ترکی قوم کی ترقی اس کا حقیقی مقصود تھا۔ علاوہ اس کے چونکہ یہ بالکل نو وارد تھا اس لئے اُس کو اندرونی راز کی باتوں میں شریک بھی نہ کیا جاتا تھا اور یہ بالکل اس کی فطرت کے خلاف تھا کہ وہ معمولی سپاہی کی طرح صرف تعمیل فرمان کرتا رہے، وہ خود ہر جگہ چھا جانا چاہتا تھا اور دوسروں سے اپنے احکام کی تعمیل چاہتا تھا۔ اسی لئے جلسوں میں اس کا انداز گفتگو نہایت تلخ ہوا کرتا تھا اور انجمن کی تمام کارروائیوں پر سخت تنقید کیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ تم لوگ باتیں بہت کرتے ہو، لیکن کام کچھ نہیں کرتے، نظریے پیش کرتے ہو مگر عمل مفقود ہے۔

اس انجمن کے قائدین میں انور، جمال، جاوید، نیازی، طلعت خاص لوگ تھے لیکن مصطفیٰ کمال ان سب کو بہت معمولی عزائم و تدابیر کا انسان سمجھتا تھا اور جب ان کا نام آتا تھا تو نہایت حقارت سے سنتا تھا اور اتنی ہی تلخی سے ان پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ الغرض وہ اپنی افتاد طبیعت و بلندی عزم کی وجہ سے انجمن اتحاد و ترقی میں کوئی خاص جگہ نہ پا سکا اور نہ دل کھول کر اس سے ملنے کی لوگوں کو ہمت ہوئی۔

(باقی)

فلسفۂ مذہب

مذہب اسلام اور اس کے مراسم و شعائر پر تفصیلی بحث و تبصرہ اگر آپ اسلام کی تقلید سمجھ کر کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصول عمر — منیجر نگار

ظلم واستبداد کے خلاف ایک خاموش جنگ

۲۰۰۰ سنہ قبل مسیح، جزیرۂ کریٹ کی خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ وہاں کے باشندوں کی نظر میں زر و دولت کی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔ ہر فرد کا فرض تھا کہ وہ خود اپنی محنت سے سب کچھ حاصل کرے اور اسلاف کی جمع کردہ دولت کو ہاتھ نہ لگائے، اسی لئے ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی ساری دولت جسم کے ساتھ سپرد زمین کردی جاتی تھی اور اولاد کا اس سے مستفید ہونا بدترین اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا۔ تقسیم دولت کا اُصول بڑی حد تک اشتراکیت پر مبنی تھا اور ہر شخص مشغول و شاد کام زندگی بسر کرتا تھا۔ قحط و فاقہ کا کہیں نام نہ تھا۔

الفامیس کا خاندان سارے جزیرہ میں بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔ اور بڑی حد تک ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ حقیقی معنی میں وہاں سرداری کوئی شئے نہ تھی۔ آپس کے فیصلے کے لئے ایک پنچایت ہوتی اور اسی کے فیصلہ پر عملدر آمد ہوتا۔

الفامیس اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا اور نہایت ہی محبوب و عزیز۔ ابھی وہ صرف چار برس کا تھا کہ یونانیوں نے جزیرہ پر حملہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو غلام بنالیا۔ عورتوں کو لونڈیوں کی طرح یونانیوں کے اشارہ پر چلنا پڑتا۔ مردوں کو ساری محنت حکومت کے لئے کرنی پڑتی اور اُن کے جسمانی و دماغی مصائب کا معاوضہ اتنا حقیر دیا جاتا کہ مشکل سے وہ زندگی بسر کرسکتے تھے۔

جزیرہ کی تاریخ میں یہ بالکل پہلا واقعہ تھا کہ کسی دوسری قوم کی حکومت وہاں قائم ہوئی، یہاں کے باشندے حکومت و غلامی، سرمایہ داری و مزدوری کے حقیقی مفہوم سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ وہاں فوج تھی کہ مدافعت ہوسکتی نہ استبداد و مظالم کی وہ خوفناک تصویریں کبھی سامنے آئی تھیں جو جذبۂ انسانی کو اُبھار کر قوت کے سامنے اپنا آخری قطرۂ خون پیش کردینے پر مجبور کردیتی ہیں۔

اول اول جب یونانی جزیرہ پر قابض ہوئے تو وہاں کی شادابی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہر طرف زر و دولت کے انبار لگے ہوئے تھے۔ یونانی ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک تنکا تک وہاں کے رہنے والوں کے لئے نہ چھوڑا۔

اس غارتگری کے سلسلہ میں سب سے زیادہ تباہی جس خاندان کو ہوئی وہ الفامیس کا خاندان تھا۔ کیونکہ اس نے حکومت کے آگے سر جھکانے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے تمام افراد زنجیروں میں جکڑ کر جلاوطن کردئے گئے، لیکن کم سن الفامیس کو اپنے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دی گئی وہ جزیرہ میں بغیر کسی سرپرست کے چھوڑ دیا گیا اور ایک

غریب گھرانہ میں حکومت نے اس کی پرورش کا انتظام اسوقت تک کے لئے کردیا کہ وہ مزدوری کرنے کے قابل نہ ہو۔ تعلیم و تربیت کا کیا ذکر تھا حکومت نے متوسط الحال طبقہ کے لئے بھی اسکو ناممکن بنادیا تھا۔

ایک ربع صدی کا زمانہ اس واقعہ پر گزر چکا ہے، جزیرہ کی تمام دولت یونان میں منتقل ہو چکی ہے۔ جہاں کی زمین زعفران اُگلتی تھی آج بنجر پڑی ہے۔ اور رعایا کی تباہی کا یہ عالم ہے کہ سامان فاقہ شکنی بھی ان کے پاس موجود نہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فحاشی مذہب کا ایک جزو قرار پا گیا تھا۔ کنواری اور حسین لڑکیاں دیویوں کے لئے وقف کردی جاتی تھیں اور کاہنوں کے لئے حلال تھیں۔

جزیرہ کی دولت کوئی پوشیدہ راز نہ تھی اس لئے حکومت کے علاوہ یونان کی پیشہ ور زنان بازاری کا بھی ایک گروہ لوٹ مچانے کو وہاں آ پہونچا تھا اور حکومت نے ان پر بھی ٹیکس عاید کردئے تھے ان میں ایک نوجوان لڑکی عذرا بھی تھی۔

الفامیس غیر معمولی حسین پیدا ہوا تھا۔ جوانی نے اس کے اعضا کو حد درجہ جاذب نگاہ بنادیا تھا۔ محنت اور کاوش کی زندگی نے جہاں اس کے چہرہ پر پُر مردگی پیدا کردی تھی وہیں اس کے اعضا کو مضبوط و توانا بھی بنادیا تھا۔ مردانہ حسن و شباب نے اس میں وہ تمام کیفیات پیدا کردی تھیں جنھیں دیکھ کر ایک عورت مشکل سے ضبط کر سکتی ہے۔ عذرا نے الفامیس کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئی۔

الفامیس جانتا تھا کہ عذرا یونانی عورت ہے اور ایک غلام کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ آقا کی ہمقوم عورت سے محبت کرے، اس لئے باوصف اس کے کہ وہ خود بھی بیقرار تھا۔ زبان سے ایک حرف نہ نکالتا تھا اور آہستہ آہستہ محبت کی آگ میں جل رہا تھا۔

ایک زمانہ دونوں کو اس آگ میں جلتے ہوئے ہوئے ہو گیا۔ اور آخر کار الفامیس، عذرا کے بے انتہا اصرار پر ایک رات اس کے مکان پر پہونچا۔ عذرا نے اسے دیکھا اور جلدی سے اُسے ایک کوچ پر لیجا کر بٹھایا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک لفظ میں اپنی تمام تمنائیں بیان کردے۔ لیکن الفاظ اور ان کی محدود وسعتیں محبت کی ترجمانی کے لئے اسے بالکل ناکافی نظر آئیں بالآخر الفامیس کی آغوش میں ایک عجیب عالم وارفتگی میں گر پڑی اور زانو پر سر رکھ کر بالکل کھو گئی۔ جب تھوڑی دیر کے بعد اس طوفان کا زور کچھ کم ہوا تو اس نے کہا۔

"الفامیس! بولو، تمھیں کس چیز نے تکلیف پہونچائی ہے۔ خدا کے لئے مجھے ان سفید ناگنوں میں شمار نہ کرو جو تمھارے ملک اور اس کے ایک ایک فرد کا خون چوسنے آئی ہیں۔ میں تمھاری ہوں اور ہمیشہ تمھاری رہوں گی۔ میرا جسم اور اس کا ایک ایک ریشہ تمھارا ہے، میری روح اور اس کی تمام گہرائیاں صرف اس لئے ہیں کہ تم ان میں سما جاؤ۔ میرا وجود صرف اس لئے ہے کہ تم اس پر چھا جاؤ۔"

الفامیس جو اب تک اظہار محبت کے رموز سے واقف نہ تھا گھبرا گیا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کس طرح جواب دے۔

ستم رسیدہ انسان کو جب کوئی ہمدرد ملجاتا ہے تو اس کے قلب میں جذبات کا ایک دریا موجزن ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کا اظہار بجز اس کے اور کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بے اختیار رونے لگے یہی حال الفامیس کا ہوا۔ عذرا کی کرمفرمائیاں اس کے لئے

بالکل نئی چیز تھی۔ بچوں کی طرح بلبلا اُٹھا اور ہچکی بند ھگئی۔

الفامیس۔ "عذرا تم کیا کہہ رہی ہو۔ اپنی فطرت۔ اپنی قومیت اور اپنی حکومت کے خلاف تم جنگ پر آمادہ ہو؟ مجھسے تمھیں کیوں محبت ہو۔ ممکن ہے تم بہت زیادہ مہربان آقا ثابت ہو سکو"

عذرا۔ "آقا! لونڈی کہو، لونڈی! مجھے دُنیا کی پروا نہیں، مال و زر کی احتیاج نہیں، الفامیس! یاد رکھو میں دنیا کی تمام طاقتوں کے خلاف تمھاری ہوکر رہوں گی۔ روح آزاد ہے اور قید و بند کی پابندیاں کسی طرح اس پر عاید نہیں ہوسکتیں"

الفامیس۔ "عذرا، کیا کہہ رہی ہو۔ تم آزاد ہو میں غلام۔ میری زندگی اور اسکی تمام مسرتیں محدود ہیں۔ حکومت کا قانون جزیرہ کے کسی باشندہ کو کسی یونانی لڑکی سے شادی کی اجازت نہیں دیتا اور شاید اسی کو روکنے کے لئے شادی پر ٹیکس عاید کر دیا گیا ہے، کہ نہ وہ ٹیکس ادا کرے گا نہ اُس کی شادی ہو گی"

عذرا۔ "الفامیس، تم اس راز کو نہیں سمجھتے۔ حکومت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایسی شادیاں بالکل روکدی جائیں۔ اصل غرض یہ ہے کہ حکومت ابھی تک اس شبہ میں ہے کہ جزیرہ والوں کے پاس ابھی روپیہ موجود ہے۔ لیکن قدیم روایات کے مطابق وہ اسے ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے گروہ کی آمد صرف اسی غرض سے تھی کہ باشندے عشق میں مبتلا ہو کر تمام زر و جواہر حکومت کے خزانہ میں منتقل کر دیں۔ میں تمھاری بے نوائی کی شہادت خود دوں گی اور حکومت کو یقین دلا دوں گی کہ تمھارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر اس کو بھی کسی نے نہ سُنا تو ٹیکس کی رقم اپنی طرف سے ادا کر دونگی"

اسوقت الفامیس کی حالت اس مجبور شیر کی طرح تھی جسے کٹھہرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ غصہ سے اپنی بوٹی نوچنے لگا۔

الفامیس۔ "عذرا، ہمارا ملک تباہ ہو چکا ہے۔ ایک اک فرد دانہ دانہ کو محتاج ہے۔ تمام کھیتیاں اُجڑ چکی ہیں۔ ملک ویران ہے۔ لیکن دشمنوں کو تسکین نہیں ہوتی۔۔۔ عذرا تم نے یہ کہا کہ میرے عوض ٹیکس تم ادا کر دوگی، لیکن تمھیں معلوم نہیں کہ یہ احسان اور وہ بھی کسی یونانی کی طرف سے مجھے کبھی گوارا نہیں ہو سکتا"

اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں الفامیس و عذرا کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ آخر کار عذرا نے درخواست دیدی کہ وہ الفامیس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور حکومت نے اجازت بھی دیدی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ الفامیس کو ایک روپیہ ٹیکس حکومت کے خزانہ میں داخل کرنا ہوگا۔ عذرا جانتی تھی کہ ایک روپیہ کی حقیر رقم بھی الفامیس ادا نہ کر سکتا تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ خود یہ ٹیکس ادا کر دے۔

الفامیس کو بھی خبر ملی۔ عذرا سے کہنے لگا۔ "عذرا تم نے سنا، حکومت نے ٹیکس لگا ہی دیا۔ ایک روپیہ کی کیا حقیقت تھی لیکن آج جان دینے پر بھی یہ روپیہ نہیں مل سکتا"

عذرا۔ "الفامیس تمھیں یاد ہوگا میں نے ابتدا ہی میں کہا تھا کہ حکومت اپنے شبہ کو دور کرنا چاہتی ہے کہ باشندوں کے پاس دفینے ہیں یا نہیں اور اسی لئے یہ ٹیکس عاید کیا گیا ہے کہ اگر یہ صحیح ہو گا تو تم ادا کر دو گے"

کئی ہفتے گزر گئے اور الفامیس کی صورت عذرا کو دکھائی نہ دی۔ عذرا کی افسردگی بڑھتی جارہی تھی۔ ایک روز کوئی مزدور جو الفامیس کے ساتھ کھیت میں کام کرتا تھا آیا اور اس نے ایک خط عذرا کو لاکر دیا اس میں لکھا ہوا تھا:۔

عذرا!

رخصت ہوتا ہوں اور شاید پھر کبھی واپس آنے کے لئے نہیں، میری آفرینش سے قدرت کو غالباً صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وہ حد درجہ پست و ذلیل انسان کو بھی وجود میں لاسکتی ہے۔ یہی حال میرے کل ہموطنوں کا ہے۔ فطرت کی یہ سب سے بڑی ستم ظریفی تھی جو میرے لئے روا رکھی کہ دل دیدیا اور بہ نہایت حساس۔ اول اول جب میں نے تمہیں دیکھا آنکھوں کے ساتھ روح نے بھی خدا جانے تم میں کیا شئے پائی کہ یہ محسوس کرنے لگی کہ میں اگر کسی طرح اپنی کلفتوں کو فراموش کرکے سکون سے ہمکنار ہوسکتا ہوں تو محض تمہاری معیت میں، تم نے میری تمنائے دل کی پذیرائی کی۔ یہ تمہارا وہ احسان ہے کہ اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اپنی عنایتوں سے تم نے میرے مستقبل کو اتنا شاندار بنادیا کہ میں نے اپنے تمام آلام بھلا دئے۔ لیکن عذرا! آج اجازت دو کہ اپنی قوم کی نکبت کی صحیح ترجمانی کرسکوں۔ یہ صحیح ہے کہ میرے لئے تم دولت لٹا سکتی ہو۔ بڑے سے بڑا ٹیکس ادا کرسکتی ہو۔ لیکن یہ بدترین ظلم ہوتا اور پھر ایک غیر محدود مدت کے لئے قوم کی غلامی مسلم ہوجاتی۔ حکومت کو غلط طور پر ہماری دولت کا یقین ہوجاتا۔ اور پھر کوئی صورت نجات کی باقی نہ رہتی اس لئے آج حکومت کے اس شبہ کو اپنی جان دیکر دور کرنا چاہتا ہوں۔

الفامیس

دوسرے دن تمام جزیرہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ سمندر نے ایک لاش کنارے پر اگل دی ہے جو بعد کو الفامیس کی ثابت ہوئی۔ تمام جزیرہ میں اس سے شورش پھیل گئی اور جب دوسرے دن عذرا کی لاش بھی اسی حالت میں دستیاب ہوئی تو یہ شورش بغاوت میں میں تبدیل ہوگئی اور آخر کار یونانیوں کو جزیرہ چھوڑکر اپنے ملک واپس جانا پڑا۔

الیاس (اسلامپوری)

"کامران"

دارالسلطنت دہلی سے ایک جدید ہفتہ وار علمی ادبی فلمی مصور رسالہ "کامران" جو شاہد احمد صاحب دہلوی کی نگرانی اور جناب فضل حق قریشی دہلوی کی ادارت میں اپریل کے پہلے ہفتہ سے شایع ہوگا۔ قیمت سالانہ [illegible] فی پرچہ [illegible]۔ نمونہ مفت

المشتہر:۔ مینیجر رسالہ "کامران"۔ کٹرہ بڑیان۔ دہلی

سوئٹزرلینڈ کا آئین حکومت

(ایک تاریخی نظر)

سوئٹزرلینڈ بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ اس کا رقبہ صرف ۶،۷۵۹ مربع میل ہے اور آبادی ۴۸۸۰۳۲۰ ہمارے بہت سے معمولی شہر اس آزاد ریاست سے کہیں بڑے ہیں۔ لیکن اکثر عبارت سے یہ مملکت ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد ملک ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے یورپ کا کشمیر سمجھا جاتا ہے اور اس بنا پر کہ لیگ آف نیشنز جیسے اہم ادارہ کا صدر مقام اسی ملک کے ایک شہر جنیوا میں ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اسوقت ہمیں اس کے ان پہلوؤں سے غرض نہیں بلکہ اس منظم سیاسی آئین کی طرف اشارہ کرنا ہے جو دنیا کے دستوروں میں بڑے پایہ کا سمجھا جاتا ہے اور حال کے بہت سے آئینوں کا ماخذ ہے چنانچہ ترکی حکومت تو آج اسی آئین پر عمل پیرا ہے۔ خالدہ ادیب خانم نے ابھی حال ہی میں ایک لیکچر میں فرمایا کہ ترک سوئٹزرلینڈ کے دستور کو اسلامی دستور سے قریب تر سمجھتے ہیں یا کم سے کم یہ کہ کوئی بات اس دستور میں اسلامی آئین کے خلاف نہیں ہے۔

اسی دستور کے متعلق ایک انگریز ماہر سیاست لکھتا ہے:۔

"افراد ملک کی وہ آزادی رائے جو بالغ شہریوں کے سیاسی اور ملکی حقوق کی مساوات پر مبنی ہے اس قدر مکمل صورت میں کہیں نہیں پائی جاتی اسی لئے اسوقت کوئی ایسی حکومت دنیا کے پردے پر نہیں ہے جس کا دفاقی، صوبجاتی اور فرقہ وار آئین اکثریت کی مرضی پر اتنا اعتماد کرتا ہو اور نئے حالات میں بنیادی تغیرات کے لئے اس قدر آسانیاں رکھتا ہو جتنا سوئٹزرلینڈ کا مندرجہ بالا آئین"

سوئٹزرلینڈ کے موجودہ آئین کی پہلی تعمیری اینٹ کب رکھی گئی، اس کا بتانا تاریخ کی بہت پیچیدہ راہوں سے گزرنا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ جس شکل میں آج وہ آئین پایا جاتا ہے اس کی ابتدا ۱۸۴۸ء سے ہوئی۔ ابتدا میں سوئٹزرلینڈ بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں پر مشتمل تھا جنھیں سوئٹزرلینڈ کی اصطلاح میں کینٹون (Canton) کہتے ہیں۔ ان ریاستوں کی شیرازہ بندی نہ کسی وفاقی آئین سے تھی، نہ کسی مرکزی قوت کے ذریعہ سے، نہ ان ریاستوں کے باشندوں کی زبان ایک تھی اور نہ ان کی روایات مشترک تھیں۔ مگر ہاں معاشرت سب کی ایک ہی قسم کی تھی اور یہی چیز اُن کے لئے پارس بن گئی۔ ہوتے ہوتے سب کے خطرات مشترک ہو گئے۔ اس لئے ان میں یہ احساس آسانی سے پیدا ہو گیا کہ ہم سب کو

متحد ہو جانا چاہئے اور ایک مرکز پر آجانا چاہئے تاکہ ہماری قوت میں اضافہ ہو اور ہم پورے طور پر دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس خیال نے مجلس وفاق کو پیدا کر دیا جسے فیڈریٹیڈ ڈایٹ (Federated Diet) کہتے ہیں۔

اس مجلس کا جلسہ سالانہ ہوتا تھا اور ہر ریاست اپنا نمایندہ برابر اس میں بھیجتی تھی۔ اور تمام اہم معاملات پر اس میں مشورہ ہوتا تھا۔ ہر ریاست اس مجلس کے فیصلوں کی پابند صرف اسی حالت میں ہوتی تھی جب وہ باتفاق آرا پاس ہوں۔

کچھ دنوں کے بعد تحریک اصلاح مذہب (Reformation movement) شروع ہوگئی۔ اس تحریک نے جرمنی میں جنم لیا مگر اس کی لہریں یہاں تک بھی پہونچیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ریاستیں تو پرانے مذہب کی پابند رہیں اور کچھ اس نئی مذہبی تحریک کی موید ہوگئیں۔ اس سے آپس میں اختلاف پڑ گیا اور صدیوں مجلس وفاق کا اثر نہ رہا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں انقلاب فرانس کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اہل فرانس نے سوئٹزرلینڈ پر حملہ کر دیا اور اس مملکت پر قابض ہو گئے۔ اب انھوں نے پرانے دستور کو تبدیل کرنا شروع کیا۔ تمام مقامی سیاسی ادارے ختم کر دئے گئے۔ ریاستوں کی خود مختاری پامال ہوگئی اور ملک کی تقسیم بالکل نئے طریقے پر کی گئی۔ پرانی حدود کو توڑ کر نئی حدود بنائی گئیں اور کل ملک کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قومی حکومت قایم کی جسے یہ اختیار دیا کہ اہل ملک سے فوجی خدمت طلب کر سکے۔ اور صوبجاتی خود اختیاری حکومت کو بیں پشت ڈال کر جس سے عوام مانوس تھے، ایک مرکزی حکومت قائم کی۔ وہ دستور جس کی رو سے اس قسم کی حکومت وجود میں آئی دستور جمہوریہ Constitution of the Helvetic Republic کہلایا اور ۱۲ اپریل ۱۷۹۸ء کو نافذ ہوا۔ اس دستور کی ناکامی اول ہی روز ظاہر ہو گئی، اس لئے نپولین نے ایک نیا دستور بنایا اور اُن تمام شہریوں کو جن کی عمر بیس برس تک تھی، یہ اختیار دیا کہ اس پر رائے دیں۔ ۷۲۴۵۳ نے اس کے موافق رائے دی اور ۹۲۴۳ نے اس کے خلاف۔ اور ۱۶۷۲ غیر جانبدار رہے۔ الخاموشی نیم رضا کے اُصول کے مطابق یہ کہا گیا کہ جو لوگ غیر جانبدار رہے ہیں وہ بھی فی الحقیقت موافق ہیں اور اس لئے قانون نافذ ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۸۰۲ء کو قانون نافذ کر دیا گیا۔ مگر حالات نے اس آئین کو بھی ناکامیاب رکھا۔ اگلی مرتبہ نپولین نے ہر ریاست کے لئے علحدہ قانون بنایا۔ یہ قانون ایک ایکٹ کی صورت میں مدون ہوا جس کا نام تاریخ کی کتابوں میں ایکٹ آف میڈی ایشن (Act of Mediation) لکھا جاتا ہے۔ اور ۱۸۰۳ء میں اس کا نفاذ کر دیا گیا۔ یہ آئین بھی صرف اسی وقت تک چل سکا جب تک کہ نپولین کی شمع اقبال روشن رہی۔ جونہی اس کو زوال ہوا، یہ بھی ختم ہوگیا۔

ان تمام تغیرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اتحاد کا تصور قوی ہوتا گیا۔ چنانچہ ۷ راگست ۱۸۱۵ء کو مجلس وفاق کی پھر تجدید ہوئی اور ۲۲ ریاستوں نے آپس میں حلف اُٹھایا کہ ہر ریاست اپنا آئین بنائے گی۔ اور وہ ریاستیں جو معاہدے کی رو سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوں گی، نہ صرف ایک دوسرے کے آئین کی وقعت کریں گی بلکہ اُسے تسلیم بھی کریں گی۔ گویا یہ طے پایا کہ ریاستیں ایک دوسرے کے تحفظ کے لئے سیاسی اشتراک عمل کریں گی اور غیر ملکی خطرات کو روکنے کے علاوہ

امن وسکون کے قیام میں ایک دوسرے کی مددگار بھی ہوں گی۔

اب سنئے کہ ان ریاستوں کو جو معاہدے کی رو سے ایک دوسرے سے وابستہ تھیں، رفتہ رفتہ مجلس وفاق میں مخصوص اقتدار حاصل ہوگیا اور اب وہ یہ چاہنے لگیں کہ جو اختیارات ان کو حاصل ہوگئے ہیں ان میں فرق نہ آئے۔ فطرتاً اس کا ردعمل ہونا چاہئے تھا، چنانچہ ہوا اور وہ یوں کہ انتہا پسند جماعت اٹھی۔ اور اس نے یہ چاہا کہ نہ صرف ان کی خودمختاری کو ختم کردیا جائے بلکہ مجلس وفاق ہی کو ایک سرے سے اڑا دیا جائے اور ایک جمہوری نظام قایم کردیا جائے۔ اس سے آپس میں تعصبات پیدا ہوگئے اور وہ اس درجہ بڑھے کہ خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ سوئٹزرلینڈ کی لڑائی (۱۸۴۷ء) میں پہلے قدامت پسندوں کو فتح ہوئی مگر اس کے بعد دوسری لڑائی میں وہ ہار گئے اور مجلس وفاق میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ خانہ جنگی اچھی چیز ہے لیکن عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد، اسی خانہ جنگی سے ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ اور اس کی کوشش ہونے لگی کہ ایک ایسا آئین بنے جسے تمام ملک کی تائید حاصل ہو۔ اور جو تمام ملک کو ایک شیرازے میں منسلک کردے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء کی مجلس وفاق نے ایک ایسا آئین ترتیب دیا جس پر دونوں جماعتیں متفق ہوگئیں۔ اس آئین کی رو سے جس میں قدیم وجدید دونوں جماعتوں کے جذبات کا پاس کیا گیا تھا دو مجالس بنائی گئیں۔ ایک کا نام نیشنل کاؤنسل رکھا گیا اور دوسری کا کاؤنسل آف اسٹیٹ۔ نیشنل کاؤنسل کا انتخاب براہ راست ہوتا تھا اور ہر بیس برس کی عمر کے باشندے کو اس میں رائے دینے کا اختیار رہتا تھا۔ یہ دونوں مجالس ملکر سات ممبروں کی ایک قومی مجلس انتظامیہ تشکیل دیتی تھیں جس کا نام فیڈرل کاؤنسل تھا لیکن یہ لازمی نہیں تھا کہ فیڈرل کاؤنسل کے ممبر انھیں لوگوں میں سے منتخب کئے جائیں جو مندرجہ بالا دو مجالس کے ممبر ہوں۔ بلکہ یہ ممبر اُن لوگوں میں سے چنے جاتے تھے جو نیشنل کاونسل میں جانے کے واقعی اہل ہوں۔ بعض طاقتور ریاستوں کو یہ مخصوص اختیار دیدیا گیا تھا کہ وہ اپنا ایک ممبر ایسے بھیجیں لیکن کسی ریاست کو ایک سے زیادہ ممبر بھیجنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ یہ فیڈرل کاؤنسل جو تین سال کے لئے منتخب کی جاتی تھی، سوئٹزرلینڈ کی آئینی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جو چیز اس کے اندر سب سے ممتاز نظر آتی ہے، وہ اُن بائیس خودمختار ریاستوں کا آپس کا معاہدہ ہے جنھوں نے کچھ انتظامات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے اور جو اس آئین کے ذریعے سے بھی اوروں سے بالادست تھیں بہت سے ایسے کام جن کے لئے وہ براہ راست مجلس وفاق کے سامنے جوابدہ نہیں تھی، فیڈرل کاونسل کے سپرد تھے۔ گو یہ لازم نہیں تھا کہ ان معاملات میں وہ مجلس وفاق کی رائے حاصل کرے۔

پھر رفتہ رفتہ قدامت اور انتہا پسندی کے امتزاج سے ایسا توازن قائم کرلیا گیا جس سے قدامت پسند اور انتہا پسند دونوں مجلس انتظامیہ میں شیر وشکر ہوکر کام کرسکیں۔ اور جس سے رفتہ رفتہ ایک مرکزی قوت پیدا ہوجائے جو یکساں طور پر سب کے لئے مشعل راہ ہو۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ ایک طرف تو قدامت پسند اپنے خصوصی حقوق کو جو انھیں میونسپلٹیوں اور بعض محکموں میں حاصل تھے، قائم رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف انتہا پسند تمام رعایا کی آزادی کے خواہاں تھے اور مخصوص ریاستوں کو پارہ پارہ کرڈالنا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوچلا تھا کہ تمام ملک کے لئے ایک ہی قسم کے قانون اور عدالتیں ہوجائیں اور

ریلوے وغیرہ بھی حکومت کے ہاتھ میں آجائیں - چنانچہ دونوں مجالس نے سنہ ۱۸۷۴ء میں یہ طے کیا کہ مروجہ قانون کو بدل دیا جائے پس ایک نیا قانون بنا اور وہ رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے ریفرینڈم کے سپرد کیا گیا - اس قانون کی رو سے ایک مستقل فیڈرل ٹریبونل (Federal Tribunal) قائم کیا گیا اور فوج کا تمام انتظام فیڈریشن کے سپرد کیا گیا - افراد کے حقوق و آزادیِ ضمیر کے تحفظ کا یقین دلایا گیا اور فیڈرل کاؤنسل اور فیڈرل ٹریبونل کے تحت میں یہ سب کچھ دیدیا گیا - کیونکہ اب تحفظات حقوق مع آزادیِ ضمیر دستور کے اساسی اجزا بن کر مجلس واضع قوانین کے حلقے سے نکل چکے تھے - ریلوے کے انتظام کی ذمہ داری اور وضع قوانین پر ریفرینڈم بھی دستور میں ایزاد کئے گئے - یہ بڑا اہم تغیر تھا اور اس کے ذریعے سے آئین میں خاصا انقلاب ہوگیا - لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس آئین کے ذریعے سے بھی سوائے اُن ریاستوں کے جنھوں نے اپنے اختیارات کو مرکز کے اختیارات میں مدغم کر دیا تھا، باقی ریاستوں کو خود مختارانہ اختیارات حاصل تھے - اور گو اس آئین کے ذریعہ سے ریاستوں کے اختیارات بڑھ گئے - مگر فی الحقیقت ریاستوں کی انفرادیت پامال نہیں ہوئی - کیونکہ اس آئین میں بھی یہی رکھا گیا کہ ایک مرکزی مجلس کا تو انتخاب براہ راست تمام باشندے کریں اور دوسری مجلس کے ممبران ریاستوں سے نامزد ہوکر آئیں - مجلس انتظامیہ بھی تقریباً اسی اصول پر رکھی گئی - اس کے صدر کو کوئی اختیارات نہیں - وہ صرف سال بھر کے لئے مقرر ہوتا ہے اور جس طرح دیگر ممبران کسی نہ کسی محکمے کے انچارج ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک محکمے کا انچارج ہوتا ہے - سنہ ۱۸۷۴ء کا دستور اجازت دیتا تھا کہ ریفرینڈم سے اس صورت میں ترمیم ہوسکیگی جب ترمیم کے منظور ہونے کے لئے نمایندگانِ جمہور اور نمایندگانِ ریاست دونوں کی اکثریت ہو - سنہ ۱۸۹۱ء میں ایک شق یہ بھی بڑھائی گئی کہ عوام کے مطالبے پر تغیرات بھی ہوسکیں گے -

(باقی)

(ڈاکٹر) سید نجم الدین احمد جعفری (بیرسٹر)

تذکرہ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لے کر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو مثلاً (آتش، آرزو، آزاد بلگرامی، احسن مارہروی، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر اقبال، امیر، انیس، بیخود، جگر، حزیں، خواجہ کراقی، دبیر، ریاض، سودا، شرر، صائب، صفی، عالی شیرازی، عزیز لکھنوی، غالب، میر و ناسخ وغیرہ وغیرہ) کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں مع جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے - قیمت مع محصول عہ

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

حیدرآباد کے نواب بہادر یار جنگ سے چند استفسارات مہدوی عقاید کے متعلق

نواب بہادر یار جنگ ۔ صدر کانفرنس مہدویان ہند
مہدوی منزل ۔ بیگم بازار ۔ حیدرآباد دکن

مکرم من

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج شریف۔ فروری ۱۹۳۵ء کے نگار میں باب الاستفسار کے تحت جناب نے "مہدوی جماعت اور امام مہدی" کے عنوان پر روشنی ڈالی ہے جناب مہدی سے متعلق دوسرے فقرے میں جناب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے گو مجھے اس سے بھی اختلاف ہے مگر میں اس پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے خیال میں اب ہرگز وقت نہیں ہے کہ مسلمان آپس میں ان مسائل مختلف فیہ کے متعلق اُلجھیں اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوں لیکن مہدوی جماعت سے متعلق فقرۂ اول میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے ان میں سے دو اُمور کی طرف آپ کو توجہ دلانا ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ اس سے مہدوی جماعت کی نسبت غلط فہمی کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ شاہ مظفر گجراتی اور اورنگ زیب کے ڈر سے مہدوی جماعت نے "تقیہ شروع کر دیا اور اب تک یہ لوگ اس کے عادی ہیں" یہ خبر میرے لئے جو مہدوی ہوں اور جس کا خاندان گزشتہ تین سو سال سے اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے بالکل نئی ہے۔ اور نہ صرف ایک مہدوی کے اصول و عمل کے خلاف بلکہ برعکس ہے مہدوی جماعت ہمیشہ اور تاریخ کے ہر دور میں اظہار حق اور آزادانہ اپنے عقیدہ کے اظہار میں مشہور رہی ہے ہر زمانہ میں اس جماعت پر اسی آزادانہ اظہار مذہب کی وجہ سے مصیبتیں آئیں اس کو اپنے وطن سے خارج کیا گیا۔ قتل و خونریزی تک نوبت پہونچی مگر کبھی اس نے اظہار حق سے گریز کیا نہ تلبیس حق بالباطل کی مرتکب ہوئی۔ عالمگیر کا یہ قول اس جماعت میں بالتواتر مشہور ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "از تقیۂ شیعاں و از اظہار مہدویاں تنگ آمدہ ام" حیدرآباد میں مہدوی بہ تعداد کثیر آباد ہیں اور آج تک ان پر کسی نے یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ تقیہ کرتے ہیں۔

میں بحیثیت ایک مہدوی کے آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مہدویہ کے نزدیک تقیہ کذب ہے اور کذب ممنوع و مقبوح۔ وہ تقیہ اور جھوٹ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور آپ کو یہ اطلاع جو ملی ہے کہ وہ تقیہ کرنے لگے یا کرتے ہیں صریح غلط اور اس قابل ہے کہ براہ عنایت آپ نگار کی آئندہ اشاعت میں اس کی تردید فرمادیں۔

فقرۂ اول کا آخری جملہ "شادی و موت کے وقت ان کے یہاں خاص مراسم ادا کئے جاتے ہیں جو عام مسلمانوں سے علٰحدہ ہیں" بھی اس قابل ہے کہ اس کی تردید کیجائے۔ جن ذرائع سے آپ نے یہ معلومات حاصل کیں مجھے افسوس ہے کہ وہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ سوا مسئلۂ مہدویت کے کہ حضرت سیدنا و امامنا سید محمد علیہ السلام مہدی موعود آخر الزماں تھے مہدوی جماعت اہل سنت والجماعت کے معتقدات سے کوئی اُصولی یا فروعی اختلاف نہیں رکھتی۔ مہدویوں کی فقہ اہل سنت کی فقہ ہے عبادات و معاملات و فرایض وغیرہ کسی امر میں ان کا کوئی جداگانہ عمل نہیں ہے۔ وہ ایمہ اربعہ کو مانتے ہیں اور بجز مسئلۂ قرأت خلف الامام کے (جس میں وہ حضرت امام شافعی کی تقلید کرتے ہیں) بقیہ تمام اُمور میں وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں۔ اگر شادی و غمی کے رسوم سے آپ کی مراد وہ ہندی رسوم ہیں جو ہندوستان میں اقامت کے بعد مسلمانوں کی تقادیب میں شامل ہو گئے مثلاً ہلدی مہندی شب گشت وغیرہ تو اس سے شاید ہی مسلمانوں کا کوئی فرقہ بچا ہوا ہو لیکن اگر طریقہ نکاح ایجاب و قبول گواہ و وکیل اور تکفین و تدفین میں آپ کا خیال ہے کہ مہدوی احکام اسلام اور عام مسلمانوں کے خلاف کوئی اور طریقۂ عمل رکھتے ہیں تو میں اس کی سختی سے تردید کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ مہدویہ کا عمل ان تمام تقاریب میں وہی ہے جو عامۃ المسلمین کا ہے اور جو بالکل احکام اسلام کے مطابق ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جو کچھ آپ نے لکھا وہ اپنی معلومات کی حد تک لکھا اور ان میں غلط ذرائع کی بنا پر غلطی کا واقع ہو جانا ممکن ہے اس لئے مجھے آپ سے شکایت نہیں ہے۔ مگر متوقع ہوں کہ اگر آپ میرے اس خط کو بھی تقیہ نہیں سمجھتے ہیں تو براہ کرم اپنی طرف سے یا میری طرف سے نگار کے صفحات پر مذکورہ دونوں اُمور سے متعلق تردید شایع فرماکر مجھے اور تمام جماعت مہدویہ کو ممنون فرمائیں۔

(نگار) میں نے فروری ۳۵ء کے نگار میں، آپ کی جماعت کے بانی و مؤسس کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ نہایت مختصر بلکہ مقتضر تھا، کیونکہ میں خود اس کو پسند نہیں کرتا کہ خواہ مخواہ کسی مسلک یا مشرب کے اُن جزئیات سے بحث کی جائے جن کا پوشیدہ ہی رہنا بہتر ہے۔ اور جن کے اعلان و اظہار پر بھی اب اس مسلک کی طرف سے کوئی اصرار نہیں کیا جاتا۔ لیکن آپ کی اس تحریر نے مجبور کر دیا کہ اب میں کسی قدر تفصیل سے کام لوں۔

اگر آپ صرف یہ لکھ دیتے کہ مہدوی جماعت تقیہ کی مخالف ہے تو بھی غنیمت تھا، اگر آپ محض اس تحریر پر اکتفا کرتے کہ

شادی و موت کے مراسم اُن کے یہاں مخصوص نہیں، تو بھی میں خاموش ہو جاتا، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ کی تحریر سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ "مہدوی جماعت اہل السنت والجماعت کے عقاید سے کوئی اُصولی یا فروعی اختلاف نہیں رکھتی"

اس لحاظ سے، کہ آپ کو فرقۂ مہدویان ہند کے صدر ہونے کا فخر حاصل ہے، یقیناً آپ کی معلومات اس باب میں زیادہ وسیع ہونا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کے علم و یقین کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔

اس کا دعویٰ تو غالباً آپ کو بھی نہ ہوگا کہ مہدوی عقاید کا علم آپ کو براہ راست جناب سید محمد کی ذات گرامی سے حاصل ہوا ہے، یا یہ کہ انھیں کی روح مقدس سے بلا کسی واسطے کے آپ کو فیضان ہوا ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ آپ کے علم کا ذریعہ بھی وہی کتابیں ہوں گی جو آپ کے اسلاف اور سید محمد صاحب کے اخلاف نے لکھی ہیں اور ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا کہ مہدوی جماعت کے عقاید اصول و فروع میں بالکل اہلسنت والجماعت کے مماثل ہیں، حیران ہوں کہ اگر یہ تقیہ نہیں ہے تو کیا ہے؟

میں فی الحال اس مسئلہ سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ جناب سید محمد جونپوری کا دعوائے مہدویت درست تھا یا غلط یا یہ کہ خود ظہور مہدی کا عقیدہ ہی سرے سے قابل قبول ہے یا نہیں۔ اور نہ میں جناب سید محمد اور مسلک مہدوین کی سیرت و تاریخ پر نقد و تبصرہ کرکے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حقائق میں اوہام کو اور واقعات میں عجائب و غرائب کو کس کس طرح مخلوط کرکے عوام کو اس طرف مائل کیا گیا۔ بلکہ میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آپ کا دعوئے عقاید کے متعلق کس حد تک درست ہے اور آپ کیونکر اپنے آپ کو اہل السنت والجماعت کے عقاید کا پیرو کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ آپ کو معلوم ہوگا (اور آپ ہی کو علم نہ ہوگا تو کس کو ہوگا) کہ آپ کے مسلک میں جناب سید محمد جونپوری کی مہدویت کی تصدیق فرض ہے، اور ۹۰۵ھ کے بعد سے (جب انھوں نے اعلان مہدویت کیا تھا) اسوقت تک جتنے انسان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں یا آیندہ پیدا ہوں گے وہ سب بسبب انکار مہدویت کافر مطلق ہیں۔ اس لئے اہل السنت والجماعت جو اُن کی مہدویت کے قایل نہیں ہیں، آپ کے نزدیک کافر ہوئے۔ پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا یہ فرمانا کہ آپ کے عقاید وہی ہیں جو اہل سنت کے ہیں۔ یہ معنی نہیں رکھتا کہ آپ ایک کافر جماعت کے عقاید کی تصدیق کرنے والے ہیں؟ ۔ اچھا اس کو بھی جانے دیجئے۔ ممکن ہے آپ اسے مغالطہ منطقی قرار دیں، اور آگے چلئے۔

(۲) کیا آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ سید محمد صاحب خلفاء راشدین سے بہ لحاظ فضایل بلند تر مرتبہ رکھتے ہیں؟

کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ سید محمد جونپوری قولاً و فعلاً معصوم تھے اور نیز یہ کہ بہ لحاظ مرتبہ وہ رسول اللہ کے برابر تھے۔ کیا آپ کی کتابوں میں یہ روایت نہیں پائی جاتی کہ تمام انبیا ناقص الاسلام تھے اور اس نقص کی تفصیل اس طرح بیان نہیں کی گئی کہ حضرت آدم صرف سر سے ناک تک مسلمان تھے، نوح سر سے حلق تک، ابراہیم و موسیٰ سینہ تک اور عیسیٰ زیر ناف تک مسلمان تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اہل سنت میں وہ کونسی جماعت ہے جو ان عقاید کی ماننے والی ہے۔ اگر آج بھی

آپ علمار اہل سنت سے استفتا کریں تو بالاتفاق سب کی طرف سے یہی جواب ملیگا کہ ان عقاید کا پیرو کافر و بیدین ہے۔

(۳) کیا عقیدہ خوند میر میں، جسے آپ حضرات "ام العقائد" کہتے ہیں، یہ مذکور نہیں کہ مومن کامل وہی ہے جو دنیا ترک کردے اور معاش و معیشت کے لئے کوئی سعی و عمل نہ کرے، اور کیا عقیدہ کی رو سے وہ شخص جو خدا کو بچشم سر یا خواب میں نہ دیکھے، مومن کہلایا جا سکتا ہے۔ پھر مجھے اس سے مطلب نہیں کہ آپ نے دنیا کو ترک کرنے کے بجائے اُسے "بہادر یار جنگ" ہونے کی حد تک حاصل کیا ہے، مومن ہیں یا نہیں، اور نہ میں یہ سوال کرنے کا مجاز ہوں کہ آپ نے خدا کو کب اور کس طرح دیکھا کہ آپ اس جماعت کی صدارت کے مستحق سمجھے گئے، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ جس حد تک اہل سنت کے عقاید کا تعلق ہے وہ ان دونوں باتوں سے بالکل علٰحدہ ہیں۔ نہ وہ ترک دنیا کو مستحسن جانتے ہیں اور نہ رویت خداوندی کو اسلام کی ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔

(۴) کیا سید محمد صاحب نے اہل سنت کی فرض نمازوں کے علاوہ ایک اور نماز، ۲۷ رمضان کی فرض قرار نہیں دی (ملاحظہ ہو تالیف سید محمد مصطفٰے مہدوی) اور کیا انھوں نے مال کی قلت و کثرت دونوں حالتوں میں زکوٰۃ میں بجائے چالیسویں حصہ کے دسواں حصہ ادا کرنا فرض قرار نہیں دیا۔ (ملاحظہ ہو ہدیۃ البراہین مصنفہ سید عبدالرحیم بن اسحاق بن عبدالحئی مہدوی) حیرت ہے کہ باوجود اس کے اصول و فروع دونوں میں اپنے آپ کو اہل سنت کا مماثل کہتے ہیں علمار اہل سنت سے دریافت کیجئے کہ وہ ان بدعات مخترع کو کیا کہتے ہیں اور ان کے ماننے والوں کو کیا سمجھتے ہیں۔

(۵) - شواہد الولایت جو برہان الدین (سید محمد جونپوری کے داماد تھے) کی تالیف ہے اور آپ کے یہاں بڑے مرتبہ کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس کے اکتیسویں باب میں لکھا ہے کہ رسول اللہ نے مہدی کے اصحاب کا مرتبہ اپنے برابر ظاہر کیا ہے اور ان کے متعلق "ہم اخوانی بمنزلتی" کے الفاظ کہے ہیں، گویا یہ الفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ سید محمد صاحب کا مرتبہ رسول اللہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

اب آپ ہی غور کیجئے کہ اہل سنت کس حد تک اس عقیدہ کے پابند ہیں اور جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے، اس کے متعلق ان کی کیا رائے ہو سکتی ہے۔

(۶) - پنج فضایل میں درج ہے کہ محشر میں محمد رسول اللہ اور سید محمد دونوں ایک نوری ہاتھی پر سوار ہوں گے جس کا نام محمودہ ہوگا، اور تمام انبیاء وغیرہ جلو میں ہوں گے، دانت اس ہاتھی کے اتنے لمبے ہوں گے کہ اس پر تمام فرقہ مہدویہ سوار ہوگا، جب اس جلوس کا گشت ختم ہو جائے گا تو خدا سے روبرو ملاقاتی آئے گا اور یہاں بی بی مریم کا نکاح رسول اللہ کے ساتھ اور بی بی آسیہ کا سید محمد جونپوری کے ساتھ ہوگا۔

معاف فرمایئے کیا اہل سنت اس عقیدہ کو برداشت کر سکتے ہیں۔

(۷) - تنبیہ الغافلین میں ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ مہدوی جماعت کے لوگ اپنے جھوٹے بڑے برابر برابر بنایا کرتے تھے۔

اور ہر جھونپڑے میں روزن ہوتا تھا تاکہ دوسرے جھونپڑے والے کے افعال سے آگاہ رہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک مہدوی اپنی عورت سے صحبت کرتا تو دوسرا مہدوی اسے دیکھتا رہتا اور یہ صرف اس لئے کہ تمام مہدوی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

کیا اہل سنت کی شریعت میں اس حرکت کو کبھی روا رکھا گیا ہے۔

(۸) جوہر نامہ میں مرقوم ہے کہ اس جماعت کے نزدیک کائنات میں چند چیزیں ایسی ہیں جو خدا کی مخلوق نہیں ہیں اور بعض ایک حیثیت سے مخلوق ہیں اور دوسری حیثیت سے غیر مخلوق۔ قسم اول میں جوہر اول اور روحِ حقیقی شامل ہیں، دوسری قسم میں رسول اللہ اور سید محمد جونپوری۔

اہل سنت کے نزدیک یہ عقیدہ شرک فی التوحید ہے اور اُن کے اُصول عقاید کے بالکل منافی۔

(۹) انصاف نامہ کے باب ہشتم سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں قمت و خوندمیر نے جو مہدوی جماعت کے اولیاء کرام ہوئے ہیں مہاجر کے ترکہ میں اس کے جائز وارثوں کا کوئی حق نہیں رکھا، بلکہ مہاجرین ہی میں اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے۔

کیا یہ فیصلہ احکام قرآنی کے خلاف نہیں ہے اور کیا اہل سنت اس کو کبھی گوارا کر سکتے ہیں۔

(۱۰) ۔مہدویہ کا عقیدہ ہے کہ اگر آنحضرت کے پاس ایک صدیق تھے تو سید محمد کے دربار میں دو تھے (سید محمود اور خوندمیر)، اگر رسول اللہ کے خلفاء راشدین چار تھے تو یہاں پانچ ہوئے ہیں اگر وہاں دس صحابیوں کو مغفرت کی بشارت دی گئی تھی تو یہاں بارہ صحابیوں کو۔ اگر رسول اللہ کی اُمت میں بہتر فرقے ہوئے تو یہاں چوہتر ہوئے جن میں صرف ایک عقیدۂ خوندمیر والا ناجی ہو۔ خوندمیر کو اسد اللہ الغالب کا بھی لقب دیتے ہیں اور ان کے بیٹے سید محمود کو امام حسین کے برابر بلکہ ان سے بہتر جانکر حسینِ ولایت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں مثلاً سید محمد جونپوری کی معراج، ان پر وحی کا نزول وغیرہ ایسی ہیں جن کو دیکھنے کے بعد ایک سنّی تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اُن کے عقیدہ کے آدمی ہیں۔ آپ خود جو چاہیں سمجھیں اور کہیں۔

ممکن ہے آپ یہ فرمائیں کہ اسلام کے اُصولی عقاید صرف توحید و تصدیق رسالت ہیں، اور چونکہ مہدویئن ان دونوں کے ماننے والے ہیں اس لئے اصولاً وہ مسلمانوں سے علٰحدہ نہیں ہو سکتے۔ میں اس کے تسلیم کرنے کے لئے طیار ہوں، اور آپ کو کم از کم میں تو ضرور مسلمان کہدوں گا، لیکن محض مسلمان ہونا تو اہلِ سنت میں شامل نہیں کر سکتا، ورنہ یوں تو شیعہ، خارجی، معتزلی وغیرہ سب اپنے آپ کو اہل سنت کہہ سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کے عقاید جنھیں بظاہر فروع سمجھا جاتا ہے۔ اُصول کو مجروح کرنے والے ہیں اور جس طرح آپکے نزدیک تمام اہل عالم کافر ہیں، بالکل اسی طرح اہل سنت کے نزدیک آپ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں، کیونکہ آپ اپنے عقاید کی رو سے شرک فی التوحید، توہین رسول، ناجائز تاویل قرآنی، انحراف شرع وغیرہ سبھی کے مرتکب ہوتے ہیں، جن میں ہر چیز علٰحدہ علٰحدہ ایک شخص کو کافر بنا دینے کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ ان سب کا اجتماع کہ اگر جبرئیل بھی فرقۂ مہدوین کے اسلام کی شہادت دیں تو اہل سنت کا حقیر سے حقیر مولوی بھی ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا۔

مکتوبات نیاز

مکتوبات کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا کیونکہ اُن کو کتابی صورت میں شایع کرنے کے لئے تمام مسودات کاتب کو دئے جاچکے ہیں۔ لیکن ناظرین نگار کے پرشوق اصرار کے سامنے ہمکو آخرکار پھر مجبور ہوجانا پڑا اور اب پھر اس سلسلہ کو شروع کیا جاتا ہے۔

مکتوبات غالبًا دو ماہ کے اندر کتابی صورت میں شایع ہوجائیں گے اور ان میں علاوہ شایع شدہ مکاتیب کے، ایسے خطوط بھی ہوں گے جو اس وقت تک نگار میں شایع نہیں ہوئے اور نہ آیندہ ہوں گے۔ نیاز

سرکار۔۔۔ عتاب نامہ ملا۔ اگر یہ کہوں کہ اس کو دیکھ کر میں کانپ اُٹھا تو واقعہ کے خلاف ہوگا اور یہ نہ کہوں تو آپ اور زیادہ برہم ہوں گے۔ عجیب کشمکش میں ہوں کہ آپ کے غصہ کا احترام اور اپنی بے گناہی کا وقار دونوں بیک وقت کیونکر قائم رہ سکتے ہیں۔

اب تو کئی دن گزر گئے ہیں، غالبًا غصہ کم ہوگیا ہوگا اور اپنی رنجش بیجا کا احساس تو خیر کیا، لیکن کم از کم دوسروں کی معذرت سننے کی تاب ضرور پیدا ہوگئی ہوگی۔

میں اصل معاملہ کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا، بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا میں آپ کا دشمن ہوسکتا ہوں، کیا میں اسدرجہ بداخلاق ہوسکتا ہوں کہ آپ ایسے محسن و کرمفرما سے منحرف ہوجاؤں۔۔۔ آپ کو تو خیر کیا غصہ آیا ہوگا۔ غصہ مجھے آیا ہے جب آپ کا خط ملا اور میں نے دیکھا کہ آپ کے یہاں قدرِ وفا اس طرح کی جاتی ہے۔ بہرحال میں پھر وہی عرض کرتا ہوں جو اس سے قبل بارہا عرض کرچکا ہوں اور اگر اب بھی آپ کو اعتماد نہیں تو خدا حافظ۔

اگر ز بندگی چوں منے ترا عار ست
تو زندہ باش خریدار بندہ بسیار ست

اجی، کیوں بناتے ہو۔۔۔ وہ اور التفات جنھیں ظلم کرنا بھی گوارا نہیں! وہ تو کہئے

خود را بزور بر ستم یار بستہ ایم

ورنہ یہ ساری "میرزا منشی" کب کی خاک میں ملگئی ہوتی۔

سچ پوچھو تو وضع نباہ رہا ہوں، ورنہ

دفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

یہ جانتا ہوں کہ فطرتاً بُری نہیں، خو بُری ہے اور یہ تم جانتے ہو کہ "خوئے بد" کے لئے بہانوں کی کمی نہیں۔ بہرحال مجھے کوئی خاص شکایت اُن سے نہیں ہے اور ہو بھی تو کس اُمید پر۔ تم نے یہ ذکر کر کے دبی ہوئی چوٹ اُبھار دی، اچھا نہ کیا۔ مگر تم کیا اُن سے کم ہو۔ میں ایک ہفتہ کے بعد کلکتہ جا رہا ہوں۔ اگر تم نے حد درجہ اصرار کیا تو شاید ایک دن کے لئے تمہارے پاس ٹھہر جاؤں، ورنہ جی تو نہیں چاہتا۔

بیرحم و غافل ایخینیں، سفاک و قاتل ایخینیں!

میرے دوست۔

میں جانتا تھا کہ اُس محفل میں میرا ذکر آئے اور تم دبی زبان سے بھی کچھ نہ کہو۔ قیامت تک ممکن نہیں۔ واللہ لطف آ گیا۔ تم یوں صاف صاف کہتے تو بات ہی کیا تھی، بہرحال تمہارا مقصود پورا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، میرا ذوق ضرور ایک حد تک آسودہ ہو گیا

پارۂ شوخ و پارۂ نمکیں
ہائے دشنام ناتمام کسے!

صدیقی۔ جی ہاں، میں کشمیر سے واپس آ گیا، لیکن اب آپ کو ساری داستان سُنانے بیٹھ جاؤں یہ میرے بس کی بات نہیں

حرفے ست ایں کہ در شب مہتاب گفتنی ست

اور اس کا موقعہ اب شاید ہی کبھی اس زندگی میں میسر آئے۔ چاندنی نام ہے انعکاس ماہ کا، نسیم باغ کی آبشاروں میں شالامار کے فواروں میں۔ سودہ یہاں کہاں؟ آپ پوچھتے ہیں کہ وہاں سے آپ کے لئے کیا لایا۔ یہ پوچھئے کہ پاس کیا تھا جو بچا لایا۔

سرزمین حُسن و عشق کے زائرین کے لئے مایۂ ناز تہیدستی ہوا کرتی ہے نہ کہ پُرمایگی۔ مگر آپ اس سے کیا واقف۔ کبھی قربانی کی ہوتی تو جانتے۔

کرم نائی کا شکریہ۔ ایک جلد "جمالستان" کی پیش کرتا ہوں، جب مشاغل حیات سے فارغ ہو کر آپ کسی اور کام میں وقت صرف کرنا پسند کریں تو اس مجموعہ پر بھی اک نگاہ ڈال لیجئے۔

داد کا طالب ہوں، کیونکہ شاعرانہ انکسار سے کام لیکر کبھی میں نے خود بھی اس کی بُرائی کسی سے نہیں کی۔ آپ اسکو جس نگاہ سے دیکھیں، لیکن چونکہ میرے ماضی کے بہت سے نقوش اس میں مرتسم ہیں اس لئے میں تو ان کی پرستش کرتا ہوں،

اور یوں بھی آپ جانتے ہیں کہ :-

خود نمائی خدا اشنا سیہاست !

بندہ نواز — باور کیجئے "پیر کنعاں" کی طرح پیراہن پرست نہیں ہوں - زمرۂ اہل یقین سے ہوں، خلوتیان راز میں سے ہوں، اور جو کچھ کہتا ہوں اس کی حقیقت مولانا روم بیان ہی کر چکے ہیں کہ

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اس میں شک نہیں کہ صورت و وضع کے لحاظ سے وہ بہت دلکش چیز ہیں، علاوہ اس کے آنکھوں میں کشش بھی ہے اور باتوں میں کافی سے زیادہ دلربایانہ انداز بھی - لیکن آپ اس تبلیغ کو عمرو زید تک محدود رکھئے تو بہتر ہے، ورنہ کیا فائدہ، کسی وقت کوئی " رند ژولیدہ مو " بگڑ گیا اور ان کی کارگاہ درویشی کے سارے تار و پود بکھیر کر رکھدئے۔

رہا میرا سوال، سو آپ کے فرمان کی تعمیل میں، لات و منات کی پرستش پر بھی طیار ہوں، ورنہ یوں آپ واقف ہی ہیں کہ میں خود کس مرتبہ کا انسان ہوں۔

زطوطیان شکر خا گوئے واز من جوئے

نشاطِ زمزمہ و لذت جگر خواری

آپ زندہ رہیں، کہ آپ کی زندگی، زندگی ہے، میں کیا اور میری حیات کیا، حشرات الارض اپنے وجود کو گوارا بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ درندے نہیں ہیں، حالانکہ نظام عالم قائم ہے صرف درندگی پر اور جو سب سے زیادہ درندہ ہے، اسی کو سب سے زیادہ جینے کا حق حاصل ہے۔

بہر حال آپ کے ولولۂ حیات کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں مگر رشک نہیں کرتا، خوشی اس لئے کہ اپنے حلقہ میں کوئی ایک تو "نبرد آزما" نکلا اور رشک نہ کرنے کا سبب یہ کہ میں آپ کی سطح پر آنے کا اہل ہی نہیں، سوختہ پر بھی ہوں اور شکستہ ناخن بھی۔

برنمی آید دلم با روزگار

شیشۂ طاقت بہ سنداں می زنم

اگر میں کبھی خط بھیجنے میں تاخیر سے کام لیتا ہوں تو خیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ

ہر دم زیادم می زدی تا یاد بسیارت کنم

لیکن تم اپنے تغافل کی کیا تاویل کر سکتے ہو۔

تیغ بر کف، بادہ در سر، خندہ پنہاں زیر لب

خیر یہاں تک تو صرف شاعری تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے کچھ خوش نہیں ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں تمھیں یاد رکھوں۔ میں نے چلتے وقت تم سے کس منت سے کہا تھا کہ دیکھو عزیز کا خیال رکھنا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا، لیکن مجھے یہ سنکر سخت صدمہ ہوا کہ تم اس غریب کو کبھی کبھی حاضری کا بھی موقعہ نہیں دیتے، ہمدردی کیا خاک کروگے۔

بہر حال میں تو مایوس ہو چکا ہوں اور اس لئے مطمئن ہوں، اس غریب کو ابھی تک البتہ یقین نہیں آیا کہ تم اس درجہ سنگ دل ہو، لیکن آخر کب تک، ایک نہ ایک دن کلیجہ پر پتھر رکھ کر وہ بھی بیٹھ جائے گا۔

عزیز گرامی - کل مکتوب سامی ملا - آج اُس کی تعمیل کر رہا ہوں - امتثال امر کی اگر کوئی اور ایسی مثال نظر آئے تو مجھے بھی مطلع فرمائیے گا۔

تصویر بھی حاضر ہے اور سوانح حیات بھی - یہ بھی مختصر وہ بھی مختصر - خدا کرے آپ آیندہ جغرافیہ و ریاضی کے جھگڑوں میں مجھے مبتلا نہ کریں، کیونکہ مجھے بھی یاد نہیں کہ کب اور کہاں پیدا ہوا، زندگی کے دیگر سوانح کا ضبط و انحصار کیسا - تاہم سنہ پیدایش و وفات کی جگہ آپ " ازل تا ابد " لکھ سکتے ہیں اور سوانح زندگی کی جگہ صرف یہ شعر

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم، پختہ شدم، سوختم

صدیق مکرم -

لطف عمیم نہیں چاہتا، نوازش خاص کا طلبگار ہوں، نگاہ تماشہ طلب نہیں رکھتا کہ تماشائے نگاہ کی تمنا ہو - دنیا کے ساتھ آپ کا جو معاملہ بھی ہو مجھے اس سے غرض نہیں، میں تو کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں جو میرے اور صرف میرے لئے ہو - اس لئے سوال التفات و عنایت کا نہیں۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو

خدا کرے یہ تقریب حسب دلخواہ انجام کو پہونچ جائے - دعا گو ہوں، جہاں رہونگا یہی زبان سے نکلے گا - شرکت پر اصرار نہ فرمائیے آپ کا حلقۂ احباب وسیع اور یہاں "طبع اندوگیں" کا یہ عالم کہ خود اپنی زندگی سے بیزار - ممکن ہے کوئی صورت ناخوشگوار پیدا ہو جائے۔

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن
ز خود رفتیم و ہم با خویشتن بُردیم دنیا را

قبلۂ محترم۔ نامۂ گرامی جسے "دفتر تدبیر و مصلحت" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، پہونچا، ان مخلصانہ ہمدردیوں کا شکریہ لیکن کیا کروں فطرتاً کج بیں ہوں اور آپ کی "صراط مستقیم" مجھے نظر ہی نہیں آتی، آپ فرماتے ہیں کہ بدنامی و رسوائی بُری چیز ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ

عشق منت می نہد آنرا کہ رسوامی کند

آپ کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ آنکھ بند کرکے اُس آواز کی طرف چلو جدھر ساری دنیا جارہی ہے، یہاں فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ جب تک خود اپنے اندر سے کوئی آواز پیدا نہ ہو قدم نہ اُٹھاؤ۔ آپ جرسِ کارواں کے پابند، میں صدائے قلب کا متمنّی، آپ کو آئین و طور کی جستجو اور یہاں

پروانۂ چراغ مزار خودیم ما

الغرض۔ من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

آپ ہی فرمائیے اتحادِ خیال کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ تاہم آپ نے جس محبت و خلوص سے میری رہبری فرمائی ہے اس کی ضرور قدر کرتا ہوں اور متمنی ہوں کہ گاہے گاہے اس "خانماں خراب" کو ضرور یاد فرماتے رہیں۔

"بزمِ سرور" کا اولین پیام اور میرے لئے!

بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم سے

اربابِ بزم کی اس "رعایتِ ذوق" کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ فی الحال اس "اعترافِ عجز" ہی کو قبول کیجئے، شب ماہ، سبزہ زار اور چند نوجوانوں کا اجتماع! یہ آپ نے کیا سنایا، یہ میں نے کیا سُنا معاذ اللہ!

بہ پرید از من دیوانہ بہ طفلاں خبرے

میں نے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا کہ شاید مجھے بھی "دعوتِ آب ہوا" دی گئی ہو۔ لیکن پھر یہ سوچکر کہ

بچہ رو بہ جلوہ آید طلب نیاز منداں
نہ دل نیاز خرم نہ لب امید خنداں

صبر کرکے بیٹھ گیا۔ تاہم میری دعائیں، میری تمنائیں اور میری ہر وہ خواہش جو پوری نہیں ہو سکتی آپ کے ساتھ ہے اور میری زندگی کے لئے یہ کیا کم ہے کہ

"ہوں تو کسی کی نگاہ میں!"

کیوں صاحب خود ہی بدگمان ہونا اور خود ہی روٹھ جانا! قیس و فرہاد ہوتے تو ایک نہ ایک دن تنگ آکر وہ بھی استعفاء محبت پیش کر دیتے، چہ جائیکہ وہ جو خود "نازیکتائی" میں آپ سے کسی طرح کم نہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ آئینِ وفاکیشی میں جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے، اس سے وہ غریب زیادہ واقف نہیں، لیکن آپ اپنی دل آزاریوں کو بھی تو دیکھئے کہ رستم و اسفندیار ہوں تو وہ بھی خون تھوکنے لگیں، چہ جائیکہ اس نزاکت پسند ہمدمِ دورِ کا آپ ہی کی طرح ایک نازک انسان۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کی ان تمام بدگمانیوں کا باعث آپ کی شدید وابستگی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ہی کی تسکین سے کب اس کا اضطراب دور ہوتا ہے۔ نہ اُس کے شوق میں اعتدال، نہ آپ کی دار و گیر کی کوئی انتہا۔ ایک نہ ایک دن اس "کارگاہِ مینائی" کا ٹوٹنا ضروری ہے۔

بہرحال اس مرتبہ تو آپ مجھ پر احسان کیجئے اور کسی نہ کسی طرح من جائیے، اس کے بعد اگر پھر کبھی آپ کو "بیگانگی" کی شکایت اس کی طرف سے پیدا ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔

تالیف خواجہ عشرت

جس کے مطالعہ سے بہت لوگ شاعر اور مضمون نگار بے مدد اُستاد بن چکے ہیں

شاعری کا مکمل سٹ — چار جلدوں میں ایک سال میں بے مدد اُستاد اچھا شاعر بن سکتا ہے۔ قیمت عہ/ر

تذکرہ آب بقا — اُردو کے بے نشاں شعراء کے حالات اور کلام کا انتخاب قیمت عہ/ر

ہندو شعراء — چار سو پچاس ہندو شاعروں کا اُردو کلام اور حالات پتہ نشان۔ قیمت عہ/ر

لغات اُردو مکمل سٹ — چار جلدوں میں فصیح اور صحیح مصادر محاورہ حروف روابط کا خزینہ قیمت ہے

مضمون نویسی — عمدہ عبارت لکھنے کے قاعدے مضمون نگاری کا اُصول نثر کا آئینہ۔ قیمت ۸/ر

زبان دانی — اُردو زبان صحیح بولنے اور لکھنے کے قواعد فصیح الفاظ کی پہچان۔ قیمت ۶/ر

اصلاح زبان اُردو — متروک الفاظ کا بیان ان کا بدل صحیح شاعرانہ خیالات سے۔ قیمت ۶/ر

قواعد میر — اُردو کے بہترین جملوں کی پہچان تذکیر تانیث کے معلوم کرنے کے قاعدے۔ قیمت ۶/ر

جان اُردو — اُردو ہندی کا فرق اُردو حرف کا ہندی سے مقابلہ اور آسانیاں۔ قیمت ۶/ر

المشتہر:۔ عشرت بکڈپو احاطہ خانساماں کیننگ اسٹریٹ لکھنؤ

باب الانتقاد

جناب سیماب اکبرآبادی کا مجموعۂ نظم

کارِ امروز، مجموعہ ہے جناب سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا۔ اس میں کم و بیش ۱۳۰ نظمیں یکجا کردی گئی ہیں جو ادبیات و اخلاقیات، سیاسیات و اثریات کے تحت میں لکھی گئی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ مفہوم و مقصود اور بیان و شاعری ہر لحاظ سے توجہ کے قابل ہیں۔

جناب سیماب کی شاعری کی تاریخ کا مجھے پورا علم حاصل نہیں ہے اور نہ اُن کے سوانح حیات سے کماحقہ آگاہی کہ میں اُن کی شاعری کے تدریجی ارتقا اور اس پر اثراتِ ماحول سے بحث کرکے پورا حقِ انتقاد ادا کرسکوں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اب سے بہت پہلے جب وہ رنگ تغزل کی طرف زیادہ مایل تھے، اُن کی غزلیں سنکر بھی مجھے لطف آتا تھا اور اب کہ ان کے دائرۂ شاعری نے وسیع ہوکر حیاتِ انسانی اور کوائفِ فطرت کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے میں بہ لحاظ شاعری اُن کی مذہب والی نظم کو بھی پسند کرتا ہوں، درانحالیکہ اُن کی طرح نہ میں بحالات موجودہ اس کا تقدس محسوس کرتا ہوں، اور نہ اسے امن و تسلی کا مضبوط حصار سمجھتا ہوں۔[1]

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا، اس مجموعہ میں ہر رنگ کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور بادی النظر میں یہ معلوم کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ ان میں سے کس مخصوص رنگ کے ساتھ ان کا فطری ذوق ملا ہوا ہے اور کس میں اکتسابی، لیکن غور کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے اور مختلف عنوانات کی مختلف نظمیں دیکھنے کے بعد متقابلاً ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان کا ادبی و محاکاتی رنگ زیادہ پختہ ہے اور چونکہ تمثالم کیفیات کو وہ زیادہ تکمیل کے ساتھ بیان کرسکتے ہیں، اسی لئے "اعتبار و بصیرت" کا سامان جو ماضی و نقوشِ ماضی ہی کی داستانوں میں زیادہ ملسکتا ہے، اُن کے کلام میں اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔

ہر فطری شاعر کسی نہ کسی فطری پیغام کا حامل ہوا کرتا ہے گو یہ ضروری نہیں کہ وہ پیغام دُنیا کے لئے مفید و ضروری بھی ہو۔ نظامِ فطرت میں اہرمن و یزداں دونوں دوش بدوش کام کررہے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جو شاعر خیام و حافظ کی طرح ساری دنیا کو

---

[1] سیماب صاحب کے اشعار یہ ہیں:-

روح کرسکتی ہے محسوس تقدس اس کا
اس کی قوت ہے شدید اس کا اثر لامحدود

مذہب امن اور تسلی کا ہے مضبوط حصار
اس کے پیرو پہ ہیں شیطان کی راہیں مسدود

"مستِ مئے ہوشربا" دیکھنا چاہتا ہے، اس کے پیام کو ہم غیر فطری پیام سمجھیں ۔۔ بہر حال ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی موضوع سخن ایسا ضرور ہوتا ہے جس سے اس کے دل کی باتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس لحاظ سے جب ہم جناب سیماب کی شاعری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق "کارامروز" سے اتنا نہیں ہے جتنا "فسانۂ دیروز" سے ہے یعنی جتنی خوبی کے ساتھ وہ "کل" کی داستان بیان کر جاتے ہیں، اتنی خوبی سے وہ "آج" کے حقایق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے یا یوں سمجھئے کہ وہ ماضی کے نقوش کو تو تکمیل کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں، لیکن حال کی تعمیر کا خاکہ ان کی قدرت سے باہر ہے۔ وہ ارضِ تاج کی کھوئی ہوئی عظمت کا مرثیہ تو اچھا لکھ سکتے ہیں لیکن دوسری ارضِ تاج پیدا نہیں کر سکتے ۔۔ اور سچ پوچھئے تو ہندوستان کا شاعر جو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ مسلمان جو ماضی کی یاد میں اپنا حال و مستقبل دونوں تباہ کر چکا ہے، اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے۔۔ جہاں آگ کا مفہوم "جمود و یخ" سے زیادہ نہ ہو، وہاں اس آگ کی حقیقت بیان کرنے والے بھی غنیمت ہیں ۔ شمع محفل کی آتش افروزیاں جب معدوم ہو جائیں تو لگن کی خاکستر میں چنگاریاں ڈھونڈھنا بھی ہر شخص کا کام نہیں ۔

میں نے اس مجموعہ کا مطالعہ بالاستیعاب تو کیا نہیں اور نہ شعر و شاعری کی کتابیں بالاستیعاب پڑھنے کی چیز ہیں ۔۔ لیکن جب کبھی فرصت نصیب ہوئی تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی نظم کو دیکھا ہو اور کاروبار کی الجھنوں اور علائق دنیا کے مخصوص سے علٰحدہ ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اسی فضا میں پہونچ گیا ہوں جسے بجز ایک حقیقی شاعر کے کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ جب اُن کی کوئی خالص ادبی نظم سامنے آگئی تو یہ کیفیت زیادہ شدید محسوس ہوئی مثلاً ایک دن میں شام کو گھوڑ دوڑ سے واپس آیا تو بہت مضمحل تھا ۔ اضمحلال ہارنے کا بھی اور دن بھر خراب و خستہ پھرتے رہنے کا بھی ۔۔۔ واپس آکر اس مجموعہ کو اٹھا لیا، فہرست میں "رنگین تیتری" پر نظر جمی، اور جب ورق اُلٹ کر اس کو پڑھا تو بڑی حد تک کوفت دور ہو گئی:

دامانِ گل سے مستی بن کر اُلجھنے والی ۔۔۔ اوراق گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی،
جذبات کی فضا میں اک ذرۂ پریدہ ۔۔۔ رنگوں کے ارتقا میں اک نقش برگزیدہ

یا ۔۔ اُڑنے لگے تو نکہت گرنے لگے تو شبنم ۔۔۔ یا ۔۔ مہکا ہوا سا شعلہ، دہکی ہوئی سی مستی

کیسی پاکیزہ تلاش ہے، کتنا لطیف پیرایۂ بیان ہے ۔

• اس کے بعد ہی میں نے تشنگی والی نظم پڑھی، کیونکہ تیتری کے ساتھ ہی قدرتاً میرا خیال عورت کی طرف منتقل ہوا اور نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کتنا لطف دے گئی ۔

چند شعر ملاحظہ ہوں :-

طلوع کون یہ ہوا صنمکدہ سے صبح کے ۔۔۔ جبین مرمریں میں شمع بتکدہ لئے ہوئے
جگائے چتونوں میں اپنی ایک سحر حسن کا ۔۔۔ نظر میں بجلیاں لبوں پہ رمز سے لئے ہوئے

خرام، آہ، وہ خرام جو ہے[1] پائے ناز سے　　　دلوں کی پائمالیوں کا فیصلہ لئے ہوئے
قدم قدم پر ایک فتنۂ قیامت آفریں　　　نقوش پا صد آئینہ در آئینہ لئے ہوئے
جمال میں بھرے ہوئے ہزار درسِ عاشقی　　　خیال میں مسرتِ مطالعہ لئے ہوئے

وہ بال جن پر اپنی جان ابرِ نوبہار دے
وہ چال جو نگاہ کو پیامِ انتشار دے

شخصی نظموں میں میرے نزدیک سب سے بہتر نظم اُن کی سری کرشن کے متعلق ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ اکابر مذہب میں سری کرشن ہی کی زندگی ایسی زندگی ہے جو شاعر کے احساسات حُسن کو بیدار کر سکتی ہے۔ انھوں نے بودھ اور رسول کائنات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن اُن میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ گوتم بودھ کے ذکر میں ان کی شاعری کا لوچ اس سے آگے نہ بڑھ سکا کہ

برف زاروں کو ترے انفاس نے گرما دیا　　　تخت شاہی کو ترے احساس نے ٹھکرا دیا

بیخودی کے نام سے جب دورِ جام بادہ[2] تھا　　　جب تجلی حقیقت[3] سے ہر اک دل سادہ تھا
نفس تھا جب عیش کو رازِ بقا سمجھے ہوئے　　　جب ہوس تھی حرف "عورت" کو خدا سمجھے ہوئے

....　　　............

علم و عرفانِ الٰہی کی شہادت تو نے دی　　　غور کرنے کی دلِ انساں کو فرصت تو نے دی

رسول کائنات کی نظم میں پہلا بند تمہیدی بہت شاندار ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:-

مسلط بزم عالم پر ہوئی یوں تیرہ سامانی　　　کہ تھی جگنو سے بھی کمزور سورج کی درخشانی
چمن کے رنگ سے تھا اہتمام اخذ تاریکی　　　سحر کے نور سے تھا انتظام ظلمت افشانی
شکنجہ جور و استبداد کا تھا اور دنیا تھی　　　کہیں فخر جہانداری، کہیں فخر جہانبانی

اس کے بعد دوسرا بند شروع ہوتا ہے جس میں کہ خصوصیات نبوی کو نہایت پاکیزہ الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً

مدبر، خاکِ بطحا نے کیا آخر نیا پیدا　　　سیاست میں بھی جس نے کی محبت کی ادا پیدا

---

[1] اس مصرعہ کا آخری حصہ تکلف سے خالی نہیں۔ اول تو "جو ہے" کا دوسرا ٹکڑا "فیصلہ لئے ہوئے" سے بہت دور پڑ گیا ہے، دوسرے پائے ناز کی ترکیب بھی محل نظر ہے۔ پہلا مصرعہ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا — خرام آہ وہ خرام جو ادائے ناز سے — خرام کے بعد پاؤں کے ذکر کی ضرورت یوں بھی باقی نہیں رہتی۔ [2] دورِ جام کہنے کے بعد لفظ بادہ کا اظہار بلاغت و فصاحت دونوں کے منافی ہے۔
[3] "تجلی حقیقت" ثقیل ترکیب ہے یوں بھی کہہ سکتے تھے:- جب حقیقت کی تجلی سے ہر اک دل سادہ تھا۔

عرب سے تا عجم وحدت کا سکہ کر دیا جاری
نیا بتخانے کے ماحول سے کعبہ کیا پیدا

سیاست کو کیا آراستہ تہذیب کامل سے
تدبر سے کیا دنیا و دیں میں واسطہ پیدا

تیسرے بند کے بھی بعض شعر نہ صرف جذبات خلوص کے آئینہ دار ہیں بلکہ قوت فکر و شاعری کو بھی پوری طرح نمایاں کرتے ہیں، مثلاً

کہیں تو زندگی پیرا بہ اعجاز لب عیسیٰ
کہیں تو خطبہ فرما اوج طایف پر کلیمانہ

فروغ آفرینش تو توں پر تیری قائم ہے
کہیں تو شمع محفل ہے کہیں تو نور کاشانہ

لیکن سری کرشن کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے اس کا انداز کچھ اور ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عنوان نے سیماب صاحب کے ساز شاعری کے اُن تاروں کو چھیڑ دیا ہے جو ان کے ذوق و احساس کو زیادہ تکمیل کے ساتھ پیش کرنے والے ہیں۔ اس نظم کی ابتدا، ملاحظہ ہو:۔

ہوا طلوع ستاروں کی دلکشی لیکر
سرور آنکھ میں نظر دل میں زندگی لیکر

گزشتہ صبح محبت کو ڈھونڈھنے نکلا
اک آفتاب، محبت کی روشنی لیکر

دوسرا بند پُر از جذبات کی جان ہے، کیسے کیسے پاکیزہ شعر نظر آتے ہیں:۔

جمال و حسن کے کافر نکھار سے کھیلا
ریاض عشق کی رنگیں بہار سے کھیلا

سمجھ کے عالم فانی کو ایک بازیچہ
کبھی چمن سے کبھی کوہسار سے کھیلا

الغرض معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیماب صاحب قدرتاً تغزل کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور جب موقعہ اس نوع کی گفتگو کا آجاتا ہے تو وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

قومی منظومات بھی اس مجموعہ میں متعدد نظر آتی ہیں جن میں مزدور، نوجوان ہندوستان سے —— آزادی —— اچھی نظمیں ہیں، لیکن خالص عشقیہ نظموں کے مقابلہ میں یہ بھی ہیچ ہیں چنانچہ چند اشعار سیماب صاحب کے اس حقیقی ذوق کے ملاحظہ ہوں:۔

یہ کون خلوتکدے سے پردے اُلٹ کے جلوے دکھا رہا ہے
یہ کس کا کافر شباب رنگیں شفق کے خاکے اُڑا رہا ہے

یہ کسکی پھولی ہتوں نے جنت کی ایک تصویر کھینچدی ہے
بہار رنگ و سرور بن کر یہ کون منظر پہ چھا رہا ہے

محبوب کے ماضی کی یاد میں ایک نظم لکھی گئی ہے، اس کا کیف ملاحظہ ہو:۔

مری نظر میں ہے دیباچہ شباب ترا
کہ مست حُسن کے نغموں سے تھا رباب ترا

وہ اپنے کیف میں خود اک طرح کی مدہوشی
وہ اک مجسمہ، آلودہ شراب ترا

وہ شوق کے لب تشنہ وہ تیرا عارض تر
وہ مشت خاک کے قبضہ میں آفتاب ترا

وہ ابتدائے محبت وہ چاندنی راتیں ‏ ‏ مرے کنار میں وہ پر سکون خواب ترا
کبھی وہ نرمیٔ گفتار پر ترا ہنسنا ‏ ‏ کبھی وہ گرمیٔ آغوش پر عتاب ترا
وہ شب کے سایہ میں کافر ملاحتیں تیری ‏ ‏ سحر کے بھیس میں وہ حُسنِ لاجواب ترا

آگرہ کے آثار قدیمہ اور خصوصیت کے ساتھ تاج محل پر جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں وہ بھی پورے برانگیختہ جذبات کا نتیجہ ہیں اور اس لئے بہت کامیاب ہیں - اس سلسلہ کی نظموں میں "تاج بہ کنار شفق" میرے نزدیک ان کی بہترین نظم ہے، چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں :-

افق کے لالہ زار سے گزر رہا ہے آفتاب ‏ ‏ فضاؤں کو سلام شام کر رہا ہے آفتاب
گلوں کے قہقہے چلے، کنول جھکا ہوا اُٹھا ‏ ‏ شفق ہوئی جو رنگ بار تاج جگمگا اُٹھا
قدح یہاں سبو یہاں، بہار چار سو یہاں ‏ ‏ سمٹ کر آگیا ہے اک جہانِ رنگ و بو یہاں
یہ ہلکے ہلکے سائے یہ نکھار برگ و بار کا ‏ ‏ کہ جیسے لمحہ اک یہی شباب ہے بہار کا

لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود ان تمام محاسن کے یہ مجموعہ اغلاط سے پاک نہیں ہے تو ہم کو افسوس ہوتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر کلام میں خواہ وہ نظم کا ہو یا نثر کا حرفی و علوی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے، لیکن غلطیوں کا پایا جانا اور وہ بھی ایسی غلطیاں کہ کہنے والا خود ادنیٰ تامل کے بعد ان کو دریافت کر سکے، یقیناً بہت تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔

اغلاط شعر دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلق عروض و قافیہ سے ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو ترکیب الفاظ اور فن معانی و بیان سے متعلق ہیں - اول قسم کی غلطیاں زیادہ تر نو مشق شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ سیماب صاحب کے مجموعہ کو اس نوع کے اغلاط سے بڑی حد تک پاک ہونا چاہئے، لیکن دوسری قسم کی غلطیاں جو زیادہ تر کہنہ مشق شعراء ہی کے یہاں نظر آتی ہیں ان کے کلام میں بھی موجود ہیں۔

سیماب صاحب نے اپنے مجموعہ کی ابتدا تین فارسی رُباعیوں سے کی ہے۔ پہلی رباعی میں خدا سے خطاب کیا ہے، دوسری میں رسول اللہ سے اور تیسری میں ساری دنیا سے۔

پہلی رُباعی یہ ہے :-

اے ربِ قدیم و کردگارِ امروز ‏ ‏ وے نزہتِ ماضی و بہارِ امروز
دیروز رہینِ منتِ رحمتِ تو ‏ ‏ لطف و کرمت ضامنِ کارِ امروز

اس رباعی میں ہر جگہ ترکیب اضافی اختیار کی گئی ہے مثلاً کردگار امروز - نزہت ماضی، رہین منت، ضامن کار وغیرہ لیکن پہلا ٹکڑا "ربِ قدیم" صفت و موصوف واقع ہوا ہے، جو علم معانی و بیان کی رو سے خلاف فصاحت ہے۔ علاوہ اس کے رب کی صفت میں جب لفظ قدیم استعمال کیا جائے گا تو اس مفہوم میں "ازل و ابد" دونوں شامل ہوں گے، حالانکہ

محل کا اقتضا یہ ہے کہ صرف ماضی یا عہد گزشتہ سے اس کو متعلق کیا جائے۔ اگر بجائے رب قدیم کے خالق دی کہا جاتا تو یہ نقص دور ہو جاتا۔

دوسری رُباعی یہ ہے:۔

اے سطوت دیروز و وقارِ امروز　　نورِ فردا و جلوہ دارِ امروز
یک سطر مرتب، عالم از دفتر تو　　مجموعۂ کار تست کارِ امروز

اس رُباعی میں رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے

تیسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ "تیرے دفتر کی صرف ایک ترتیب دی ہوئی سطر اک دنیا ہے" لیکن چوتھے مصرعہ میں بیان کا یہ ارتقاء گھٹ کر اس حد تک اُتر آیا ہے کہ کار امروز کو اس کا مجموعۂ کار بتایا جاتا ہے، حالانکہ ہمارا تمام مجموعۂ کار اس کے صرف ایک لفظ یا ایک اشارہ کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ چوتھا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا:۔

یک لفظ تو، سازِ جملہ کارِ امروز

تیسری رُباعی ملاحظہ ہو، جس کا عنوان اساسِ فردا ہے:۔

فارغ منشیں ز اقتدارِ امروز　　مستقبلِ تُست در کنارِ امروز
دانی کہ سوادِ دفترِ فردا چیست　　یک نقطۂ آخرِ زدہ بہ کارِ امروز

رباعی بہت اچھی ہے لیکن مجھے لفظ نقطہ پر اعتراض ہے۔ دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو کل کی ترقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی بنیاد آج ہی پڑتی ہے، مدعا یہ کہ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لو۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کام میرا اضافہ نقطہ کا ہوا کرتا ہے یا نکتہ کا۔ ہر چند سوادِ دفتر کی رعایت سے نقطہ زیادہ مناسب ہے لیکن کار امروز کے لحاظ سے نکتہ ہونا چاہیئے پھر چونکہ کارِ امروز ردیف و قافیہ ہونے کی وجہ سے بدلا نہیں جا سکتا اس لئے پہلے ہی مصرعہ میں تبدیلی کی ضرورت تھی اور اگر لفظ سواد نکال کر اساس اور دوسرے مصرعہ میں بجائے نقطہ کے نکتہ کر دیا جاتا تو یہ نقص دور ہو جاتا۔

اس کے بعد نوائے تجدید کے عنوان سے یک ترجیع بند نظر آتا ہے جس کا پہلا بند یہ ہے:۔

میں کہ اس ہنگامۂ ہستی میں صرفِ نالہ ہوں　　خونچکاں اپنے لبِ فریاد کا تبخالہ ہوں
اہمیت نشوونمائے دل کی باقی ہو چکی　　اب لہو جس سے ٹپکتا ہے وہ شاخ لالہ ہوں
میری ہر اک سانس سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں　　خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں
زندگی کی ڈھونڈھتے ہو مجھ میں کیا چنگاریاں　　اک حریمِ عیش کی خاکسترِ صد سالہ ہوں

جب وہ صہبائے معطر جام میں باقی نہیں
مستیٔ تخلیق میرے نام میں باقی نہیں

اس نظم کے ذریعہ سے شاعر نے اس خیال کو ظاہر کرنا چاہا ہے کہ ہم بحالت موجودہ نہایت ہی پستی و ذلت کی حالت میں ہیں لیکن ہمارا یہ زوال ہی اپنے اندر عروج کے اسباب پنہاں رکھتا ہے اور یہی وہ راز ہے جس کو شاعر نوائے تجدید کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

کسی مخصوص خیال یا مخصوص نظریہ کے ماتحت کوئی نظم کہنا حد درجہ دشوار ہے کیونکہ فراوانی جذبات کی وجہ سے ایک شاعر بسا اوقات ربط بیان کو ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے اور متعارض خیالات نظم ہو جاتے ہیں۔ اب اسی بند کو دیکھئے کہ اس کے بیان میں کتنا عدم توازن اور کس قدر تخالف و تضاد پایا جاتا ہے۔ پہلے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اُس وقت ہنگامۂ ہستی میں میرا نالہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے تنجا لہ سے خون ٹپکنا کہ یہ زاری و بیکسی کا انتہائی دلدوز منظر ہے۔ لیکن دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں تعارض پیدا ہو گیا۔

اول تو "ماہیت کا پانی ہو جانا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دوسرے یہ کہ دل کے نشو و نما کی ماہیت یہی ہو سکتی ہے کہ اس سے خون ٹپکے، سو وہ دوسرے مصرعہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کا پانی ہو جانا کیا معنی۔ اگر شعر یوں ہوتا تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

کیفیت تخلیقِ آب و رنگ کی باقی نہیں اب لہو جس سے ٹپکتا ہے وہ شاخِ لالہ ہوں

تیسرا شعر یہ ہے:-

میری ہر اک جست سے پیدا ہیں لاکھوں بجلیاں خرمنِ آتش زدہ کا شعلۂ جوالہ ہوں

پہلا مصرعہ اصل مفہوم کے بالکل منافی ہے، کیونکہ ہر اک جست سے لاکھوں بجلیاں پیدا ہونا تو عروجِ عمل کا ثبوت ہے نہ کہ انحطاط و زوال کا۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں شعلۂ جوالہ مناسب نہیں علی الخصوص اس حالت میں کہ اس کے بعد ہی دوسرے شعر میں شاعر اپنے آپ کو خاکسترِ صد سالہ اور زندگی کی چنگاریوں سے بالکل خالی ظاہر کرتا ہے۔

ٹیپ کا شعر ہے:-

اب وہ صہبائے معطر جام میں باقی نہیں مستیِ تخلیق میرے نام میں باقی نہیں

اگر دوسرے مصرعہ کا تعلق پہلے سے لف و نشر مرتب کی صورت میں ہے تو صہبا کا تعلق مستی سے تو ہو سکتا ہے لیکن تخلیق کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح جام و نام میں باہمد گر کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن اگر ان دونوں مصرعوں کو علٰحدہ علٰحدہ مستقل مفہوم کا حامل سمجھا جائے تو بھی محض نام سے مستیِ تخلیق کو متعلق کرنا بغیر ثبوت پیش کئے ہوئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس نظم کے دوسرے بندوں میں بھی کہیں کہیں اسی نوع کا عدم توازن پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ "خواب حسین" کی ترکیب توصیفی استعمال کی گئی ہے جو درست نہیں۔ کیونکہ لفظ حسین نہ فارسی ہے نہ عربی۔ نظم درۃ التاج میں بھی ایک جگہ "مہمانِ حسین" نظر آتا ہے اور صفحہ ۸، پر بھی "جزوِ حسین" لکھا گیا ہے۔ نظم شعلۂ احساس کے آخری بند میں زندگی کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ۔

زندگی، ہستیِ مرحوم پر احساں کر دے پھر مرتب مرے اجزا پریشاں کر دے

پھر بنالا مجھے رنگینیِ دامانِ بہار
پھر گلستاں میں گل ولالہ بداماں کر دے

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ یکسر آورد و تکلف ہے اور زندگی کو بغیر حرف ندا کے استعمال کرنا اس موقعہ پر مناسب نہ تھا۔

دوسرے شعر میں بنالا بجائے بنادے کے استعمال کیا گیا ہے اور گل ولالہ بداماں کی ترکیب بھی قابلِ احتراز تھی۔ فارسی میں "گل بداماں - لالہ بداماں"، علٰحدہ علٰحدہ لکھ سکتے ہیں لیکن گل ولالہ کو حرف عطف سے ملاکر گل ولالہ بداماں لکھنا درست نہیں۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

سونپ دے پھر مجھے رنگینیِ دامانِ بہار
پھر گلستاں میں مجھے لالہ بداماں کر دے

اس طرح دونوں مصرعوں میں مجھے کی تکرار بھی ہوجاتی جو بیان کی قوت کو اور بڑھانے والی ہے۔

اس کے بعد کا شعر ہے:۔

جمع کر کے مرے سامانِ نواسنجی کو
بربطِ خامشیِ عالم امکاں کر دے

بربطِ خامشی کے معنے یہ ہیں کہ خاموشی خود بربط کا کام دینے لگے، درانحالیکہ پہلے مصرعہ میں سامان نواسنجی کہکر خاموشی کے امکان کو دور کر دیا گیا ہے۔

ایک نظم طلوعِ سیاست کے عنوان سے صفحہ ۲۸ پر نظر آتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

محفلِ عالم جمالِ حسن سے خالی ہوئی
صبح کی صورت جہنم کی طرح کالی ہوئی

جمال اور حسن تقریباً ایک ہی چیز ہے۔ فارسی میں لفظ جمال جلوہ کے معنے میں بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن زیادہ تر اسی وقت جب بجائے کیفیت ادراک کے کسی محسوس شے سے اسے منسوب کیا جائے، مثلاً جمال رُخ، وغیرہ۔ اس لئے اگر بجائے جمال کے فروغ یا وجود کا لفظ استعمال کیا جاتا تو یہ نقص دور ہوجاتا۔

اسی نظم کا آخری شعر یہ ہے:۔

مستقل جو عہدِ شخصیت کی لعنت ہوگیا
نام اس قانونِ وضعی کا سیاست ہوگیا

شاعر اپنے مفہوم کو اچھی طرح ظاہر نہیں کرسکا۔ اس کی تعقید کو دور کرکے اگر نثر کی جائے تو عبارت یوں ہوگی کہ

"جو (قانون) عہد شخصیت کی مستقل لعنت ہوگیا، اس قانون وضعی کا نام سیاست ہوگیا"۔

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس چیز کو اس وقت سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً ایک ایسا قانون ہے جو محض استبدادی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

"شخصیت" اور "قانون وضعی" دونوں اصل مفہوم سے بالکل علٰحدہ ہیں۔ نہ لفظ شخصیت سے (Autocracy) کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، اور نہ قانون وضعی سے قانون استبداد کا۔

اس کے بعد صفحہ ۵۱ پر ایک نظم بیسویں صدی بکرمی کے عنوان سے درج ہے۔ اس نظم کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کے

اہلِ مذاہب کو باہم گر رواداری کی تعلیم دیجائے اور بتایا جائے کہ اس سے قبل ہر مذہب دوسرے مذہب کا احترام کرتا تھا۔
اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:۔

اک دور وہ تھا روح فزا، کیفیت اندوز، کعبے میں تھی اک عید تو بتخانے میں نوروز
تھا برہمن و شیخ میں اک ربطِ مسلسل ناقوس و اذاں کا تھا ہر اک نغمہ دل افروز

شاعر اس خیال کے اظہار سے ابتدا کرنا چاہتا ہے کہ اب سے پہلے شیخ و برہمن یا مسلم و غیر مسلم میں بہت اتحاد پایا جاتا تھا اور ہر ایک دوسرے کی مسرت میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن پہلے شعر کے مصرعۂ دوم کی تعبیر ناقص اس مفہوم کو پوری طرح ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

اول تو بت خانے کو نوروز سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ظاہر کرنا تو یہی ہے کہ باوجود اس کے کہ بت خانہ کو نوروز سے کوئی واسطہ نہیں، وہاں یہ رسم منائی جاتی تھی، تو پھر "کعبہ میں تھی اک عید" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ عید تو کعبہ والوں ہی کی ہے۔ اس لئے باہم گر ارتباط کے اظہار کے لئے اس مصرعہ کو یوں ہونا چاہئے تھا۔

آتشکدہ میں عید تھی، اور کعبہ میں نوروز

چند اشعار کے بعد موجودہ حالت کو ان الفاظ میں دکھایا گیا ہے کہ:۔

ہر رگ میں ہر پھول میں جھکی ہوئی سازش ہر ساز کی آواز میں دہکا ہوا اک سوز

پہلے مصرعہ میں جھکی ہوئی سازش محل نظر ہے اور دوسرے مصرعہ میں " دہکا ہوا سوز" اصل مفہوم کے منافی پڑتا ہے، کیونکہ ساز میں سوز ہی ہونا چاہئے خواہ وہ دہکا ہوا ہو یا بے دہکا ہوا۔ یہ شعر اگر یوں ہوتا تو مناسب تھا:۔

ہر برگ میں ہر پھول میں اک نکہتِ مسموم ہر ساز کی آواز میں اک شورِ سکوں سوز

آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

مندر کے مغنی سے خدا را کوئی کہدے اے مرغِ سحر ضبط ز پروانہ بیاموز

ضبط کی تعلیم صرف مندر کے مغنی کو دینا اور اہل صومعہ کو علحدہ کر دینا نظم کی اصل روح کے منافی ہے، علاوہ اس کے یوں بھی مرغِ سحر کی رعایت سے پہلے مصرعہ میں بجائے (مندر کے مغنی) کے (مسجد کے موذن) کو لانا چاہئے تھا۔

اس کے بعد سیماب صاحب نے اہلِ عالم کے نام ایک پیغام پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں نظم اچھی ہے لیکن کہیں کہیں اسی نوع کے اسقام اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ عہد ماضی اور اس کی محبت وصداقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ایک آزردہ سی چتون میں بھی تھا حُسن کشاد ایک دزدیدہ نظر بھی گرمیِ افسانہ تھی

اول مصرعہ کا مفہوم انھوں نے یہ رکھا ہے کہ اگر پہلے باہم گر آزردگی بھی پیدا ہو جاتی تھی تو اس میں صداقت پائی جاتی تھی۔ لیکن بہ لحاظ فن شعر اس میں تین سقم نظر آتے ہیں، اول تو چتون کے ساتھ لفظ ایک کا استعمال زاید و بیکار ہے، دوسرے

لفظ (سی) یہاں بے موقعہ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ محل تو یہ تھا کہ چتون کی آزردگی کو پوری طرح متعین کر دیا جائے نہ یہ کہ ستی کہکر اس میں اور ضعف پیدا کیا جائے، تیسرے حُسنِ کشاد کی ترکیب ناپسندیدہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ نقص ہے کہ مقصود بیان کے لحاظ سے لفظ افسانہ لانے کا یہاں کوئی موقعہ ہی نہ تھا (گرمی محفل) البتہ کہہ سکتے تھے اس کے علاوہ (دزدیدہ نظر) سے فسانہ کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ یہ شعر یوں زیادہ برمحل ہوجاتا:-

اپنی آزردہ نگاہی میں بھی تھا حُسنِ خلوص
اُن کی دزدیدہ نظر بھی رشکِ صد میخانہ تھی

اس نظم کے چوتھے بند میں شاعر نے اس خیال کو نظم کیا ہے کہ فطرت کے مظاہر و آثار جو پہلے تھے اب بھی وہی ہیں یعنی

دینِ فطرت بھی وہی آئینِ فطرت بھی وہی
صبح کی رو بھی وہی رفتارِ ظلمت بھی وہی

ہے وہی خاکِ چمن کی ماہیت[1] گُل آفریں
رس وہی غنچوں میں پھولوں میں لطافت بھی وہی

اگر اس بند میں تمام نوامیس فطرت کو اسی طرح سادگی سے بغیر کسی آورد و تصنع کے ظاہر کر دیا جاتا تو نہایت مکمل بند ہو جاتا لیکن دو شعر ایسے آگئے ہیں جن کے ایک ایک لفظ نے بند کے اس انداز کو خاک میں ملا دیا۔ وہ دو شعر یہ ہیں:-

چاند کی نظروں میں ابتک ہے وہی عالم کشی
سینۂ خورشید میں سوزِ حقیقت بھی وہی

گرمی تخلیق میں ابتک وہی ہے سوز و ساز
عشق میں اور حُسن میں رسمِ محبت بھی وہی

معلوم نہیں عالم کشی سے کیا مراد ہے۔ غالباً یہ کہ چاند کی نگاہیں دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں، لیکن یہ ترکیب بالکل ناپسندیدہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (حقیقت) بالکل بیکار ہے۔ اور اس نے بند کی خصوصیت بیان کو داغدار کر دیا۔ اسی طرح دوسرے شعر میں لفظ (تخلیق) اسراسر بے محل ہے اور پورا مصرعہ بے معنی ہو گیا ہے۔

میرا مشورہ ان دونوں شعروں کے متعلق یہ ہے:-

سینۂ خورشید میں ابتک وہی ہے التہاب
چاند کی کرنوں میں پردازِ لطافت بھی وہی

عشق میں اور حسن میں ابتک وہی ہے سوز و ساز
خوئے ضبط اُسکی وہی، اور اِسکی نخوت بھی وہی

بعض بعض نظمیں اس میں ایسی نظر آتی ہیں جو بالکل نکالدینے کے قابل تھیں، ان میں سے ایک "ذروں کا مستقبل" ہے۔

اس نظم کو سیماب صاحب نے غالب کے اس شعر سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اور اس طرح اس کی ابتدا کرتے ہیں:-

نہ ٹھکرا خاک کے ذروں کو یوں بائے حقارت سے
کہ ہر ذرہ ہے اک جزوِ حسین[2] اجسام[3] ہستی کا

---

[1] یہاں ماہیت بجائے خاصیت کے استعمال کیا گیا ہے۔ [2] "جزوِ حسین" کی غلط ترکیب کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ [3] لفظ (اجسام) کے ساتھ (ہستی) کی تخصیص بے معنی ہے۔ صرف (اجسام) کہدینا کافی تھا یا پھر اسکی صفت جمیل وغیرہ بیان کیجاتی تو بیشک ایک بات پیدا ہو جاتی۔

اس نظم کا چوتھا شعر ملاحظہ ہو:-

غرور و کبر جو ہر بنکے ابتک اڑ گئے ہوتے　　اگر ٹھنڈا نہ پڑتا جوش آتش زار ہستی کا

اگر اس شعر کی فارسیت اور ترکیب کی تمام اُلجھنوں کو دور کر کے سہل و سادہ الفاظ میں مفہوم کو ظاہر کیا جائے تو یہ ہوگا کہ-
" اگر انسان فنا نہ ہوتا تو غرور و کبر باقی نہ رہتے" گویا کبر و غرور کا وجود انسان کے فانی ہونے کی وجہ سے ہے اور اس مفہوم کا اہمال ظاہر ہے

ساتواں شعر اس سے زیادہ بے معنی ہے۔ لکھتے ہیں:-

پس تکمیل جب اجسام مل جاتے ہیں مٹی میں　　اُبھر آتا ہے ذرہ بن کے حصہ نقص ہستی کا

یعنی جب اجسام اپنی تکمیل کے بعد مٹی میں مل جاتے ہیں تو نقص ہستی کا حصہ ذرہ بن کے اُبھر آتا ہے۔ معلوم نہیں سیماب صاحب نے کس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہا ہے اور پہلے مصرعہ کی (تکمیل) اور دوسرے مصرعہ کے (نقص) کو وہ کیونکر مربوط کریں گے۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ہر نظم پر علحدہ علحدہ تبصرہ کروں اور نہ اس کی ضرورت، لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے اسقام سے ان کی کوئی نظم خالی نہیں۔

اب میں مختلف مقامات سے مختلف اشعار پیش کر کے مختصراً اُن کی غلطیوں پر سیماب صاحب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

صفحہ ۳۱- دے رہیں مینارِ منزل سے پیام صبحِ نو　　جلوۂ امید بن تصویر مستقبل میں آ

اصل لفظ مُنارہ اور مینار رہتد ہوا ہے۔ اُردو میں بغیر ترکیب کے تو مینار لکھ سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے فارسی یا عربی لفظ کے ساتھ اسکی اضافت درست نہیں۔

صفحہ ۷۹- وہ ناجائز جتھا، خود رائے، خود بیں۔ خود پرستوں کا　　وہ ناشایستہ حلقہ بے حیاؤں، فاقہ مستوں کا

اُصولاً پہلے مصرعہ میں (خود رایوں، خود بینوں) ہونا چاہئے تھا۔ ہر چند اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ (خود رائے و خود بیں) (جتھا) کی صفت ہے اور اس مصرعہ کی نثر یوں ہوگی۔ وہ خود رائے، خود بیں ناجائز جتھا خود پرستوں کا۔ لیکن اس طرح اسکا تقابل دوسرے مصرعہ سے باقی نہ رہیگا۔ پہلا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا۔

وہ ناجائز جتھا، ہرزہ سرایوں، خود پرستوں کا

صفحہ ۱۱۹- جب محفلِ افراد میں ہو انتشار مستقل　　جب شورش ایام کی ہر موج طوفاں خیز ہو
بھیلی ہوئی ہو جب وبا دنیا میں استبداد کی　　جب ہر نفس ہو مضطرب، ہر آنکھ اشک انگیز ہو

پہلے شعر کے اول مصرعہ میں لفظ (افراد) نہ صرف بیکار بلکہ غلط ہے، دوسرے مصرعہ میں شورش کے لئے موج پیدا کی گئی ہے درانحالیکہ محض (شورش) کو تموج سے کوئی واسطہ نہیں۔ میری رائے میں یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:-

جب انتشار افراد کا اک مستقل آزار ہو　　جب شورش ایام کا سیلاب طوفاں خیز ہو

دوسرے شعر میں اشک انگیز کی ترکیب درست نہیں۔

فارسی میں - اشک چکیدن - اشک ریختن، اشک باریدن، اشک چیدن، اشک فشاندن، اشک فرو خوردن اشک رویدن، اشک شکستن، تو آتا ہے لیکن اشک انگیختن مستعمل نہیں اور نہ معناً درست ہے، کیونکہ انگیزیدن اور انگیختن کے معنے بلند ہونے، بلند کرنے کے ہیں، اور پیدا کرنے، ظاہر کرنے کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لیکن جب تک کسی چیز میں کیفیت بلندی کی نہ پائی جائے اس کے ساتھ اس مصدر یا اس کے مشتقات کا استعمال درست نہیں - آنسو میں کیفیت نیچے گرنے کی ہے نہ کہ اوپر بلند ہونے کی - یوں البتہ کہہ سکتے تھے :-

جب ہر نفس ہو مضطرب، اور اشک غم آمیز ہو

اس نظم کے دوسرے بند کا شعر ہے :-

پھولوں کے دل میں کھولدے باد چمن کے راستے ہموار کر دے دشت میں بکھرے ہوئے ذرات کو

بکھرے ہوئی چیزوں کو ہموار نہیں کیا جاتا بلکہ یکجا کیا جاتا ہے -

اس بند میں رات، جذبات، حالات و محسوسات کو ہم قافیہ رکھا گیا ہے جسکی صحت کے متعلق سیماب صاحب کو خود ہی غور کرنا چاہئے -

اس نظم میں عنوان کو ملا کر آٹھ جگہ (نصب العین) بہ سکونِ (صاد) استعمال کیا گیا ہے مثلاً

شاعر کے نصب العین میں تہذیب عالم ہے یہی وغیرہ وغیرہ - حالانکہ صحیح (نصَب العین) بہ فتح (صاد) ہے -

عربی میں نصب و نصَب دونوں آتے ہیں لیکن ان کے معنے میں فرق ہے - نصْب کے معنے، بحالت اسم تعب و غم کے آتے ہیں اور مصدری حالت میں قایم کرنا یا بلند کرنا - اور - نصَب کا مفہوم ہے جد و جہد کرنا، نصَب العین سے مدعا کسی عزم یا منزل کو مخصوص و متعین کرنا ہے اور اس لئے نَصَب العین ہونا چاہئے، عربی میں بلند جھنڈے، میلِ راہ اور نشانِ منزل کو نَصَب ہی کہتے ہیں -

صفحہ ۱۲۷ -

آہ، لیکن ہے وہی تیرگی خلوتِ غم نہ تجلّی مسرت نہ تجلائے سکوں

تجلّی و تجلّا دونوں ایک ہی لفظ ہیں - اگر بجائے تجلائے سکوں کے تولائے سکوں ہوتا تو یہ نقص دور ہو جاتا -

صفحہ ۱۲۸ - (نظم تاروں کا گیت)

ہم برق کے زندہ ٹکڑے ہیں ہم جنت کے پروانے ہیں لبریز شرابِ فطرت سے بے گردش کے پیمانے ہیں

تاروں کے متعلق (جو رات دن گردش میں ہیں) یہ کہنا کہ وہ بے گردش کے پیمانے ہیں، عجیب بات ہے،

دوسرا مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا :-

لبریز جمالِ فطرت ہیں، ہم نور بھرے پیمانے ہیں

اسی نظم کا ایک شعر ہے:-

ہاں فرق اگر ہے تو اتنا تم اپنی حقیقت بھول گئے ہم اپنی حقیقت پہچانے، باطل کی لعنت بھول گئے

"ہم نے اپنی حقیقت پہچانی یا ہم اپنی حقیقت پہچان گئے" کی جگہ (ہم اپنی حقیقت پہچانے) نظم کیا گیا ہے۔

(باقی)

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۸ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۴۰۱ سنہ ۱۹۳۴ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیٰ دوبر ولد تلک قوم پاسی ساکن سرون کھیڑہ پرگنہ مہونہ ضلع لکھنؤ

بنام
۵ - رجولال رستوگی ساکن راجہ بازار لکھنؤ
۶ - جے کرشن لال کایستھ ساکن مہونہ ضلع لکھنؤ
۷ - فتح بہادر کایستھ ساکن مہونہ ضلع لکھنؤ
۹ - بدری پرشاد رستوگی ساکن راجہ بازار لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۱۷ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۴ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زاید نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ چار ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بنا برمزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کرسکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہوکر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اُس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۱۵ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط منصرم

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

اسد اللہ الغالب

افراد عالم کے لئے جو رسول تھا اور عالمین کے لئے بشیر و نذیر بنا کر جس کو خدا نے آخری طور پر نسل انسانی کو غلط راہوں سے ہٹا کر صراط مستقیم پر چلانے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے سب سے بہتر قرن کے لئے بہترین قلوب کو چنا۔ اپنی صحبت و رفاقت میں رکھا اور پھر ان میں ہر ایک کو "بایہم اقتدیتم اہتدیتم" کی سند عطا کر کے سارے بنی آدم کو حکم دیا کہ "ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے سیدھی راہ پاؤ گے۔"

مردوں میں ایک ایسا جوان مرد اسلام نے پیدا کیا۔ جو جوانی سے پہلے بلکہ عہد طفولیت کے آغاز ہی سے اگر سات سال نہیں تو باتفاق محدثین و مورخین آغوش نبوت میں اپنی عمر کے آٹھویں سال قطعی طور پر آ گیا تھا۔

محمد بن اسحاق "صاحب سیرہ" نے لکھا ہے کہ "فاخذ[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیاً وضمہ الی صدرہ۔

پھر کون نہیں جانتا کہ جس نے نبوت کے آغوش میں ہوش سنبھالا تھا اس نے سب سے پہلی دفعہ جب غیب کے عالم قدس سے اس خاکدان شہادت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا تو کیا یہ وہی جگہ نہ تھی جس کے متعلق ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مخالف اثرات سے مامون ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے جلیل القدر محدث حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور محدث حاکم سے ناقل ہیں۔

"وقد[2] تواترت الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیر المومنین علیاً فی جوف الکعبۃ"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلی دفعہ جب اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے کھانے پر جمع فرمایا اور اسوقت دریافت فرمایا کہ میرا کون ساتھ دیتا ہے۔ تو ایک نو عمر بچہ نے جواب دیا کہ "گو میرے پاؤں کمزور ہیں لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" ابولہب اس پر ہنسا کہ بس اسی ایک لڑکے کے بھروسہ پر تمہارا کام چلیگا۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ جسے لڑکا سمجھا گیا تھا اسی نے تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا اور جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ اس نے حضر موت کی بنی ہوئی سبز چادر میں اپنے کو اس وقت لپیٹا جس وقت سب کہہ رہے تھے کہ موت کی اس چادر میں لپٹ کر سونے والا شاید کبھی نہیں اٹھے گا حالانکہ جو سویا تھا وہی جاگا اور ابد تک جاگ اسی کے لئے ہے۔ اور جو کفار حملے کے ارادے سے جاگ رہے تھے

---

[1] گھیر لیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو (حضرت ابوطالب سے) اور لپٹا لیا اپنے سینہ سے۔ [2] یہ متواتر ہے کہ سیدتنا فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے امیر المومنین حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کی ولادت کعبہ کے اندر ہوئی۔

وہی سو گئے اور نامرادی کی نیند صرف ان ہی کے لئے تھی۔

نبوت کی شعاعوں کو دیکھو تو دنیا میں کون پھیلا رہا ہے۔ بدر میں ادھر کفار حملہ آور ہیں اور اُدھر رسول اللہ سر بسجود ہیں کہ اگر آج اس چھوٹی سی جماعت کی نصرت نہ کی گئی تو اے خدا! زمین پر پھر تیری پرستش نہ ہوگی۔ مسلمانوں کے متعلق قرآن خبر دے رہا ہے کہ وہ گمان کر رہے تھے کہ ہم موت کی طرف کھینچے جا رہے ہیں لیکن جب قریش کے سورماؤں نے اپنے پرچم ہلا کر غرور کے لہجہ میں پکارا کہ " یا محمدؐ اخرج الناس اکفارنا[1]" تو لوگوں نے اسی اُنیس (۱۹) سالہ نوجوان کو دیکھا جس کے متعلق ابولہب نے کہا تھا کہ کیا اس لڑکے کی مدد کام آئے گی؟ اور اسی کی مدد سے نہ صرف جنگ بدر بلکہ جنگ اُحد میں بھی مسلمان کامیاب ہوئے۔

پھر اور آگے چلکر دیکھئے کہ خندق کی بازی کس نے جیتی؟ خیبر کا دروازہ کس نے اُکھاڑا؟ اور لوگ کیوں تعجب کرتے ہیں اگر حضور نے جناب امیر کو انا منک کہکر مخاطب کیا۔

محمدؐ کا پیغام، جہاں کہیں پہونچا، اس کی پہونچانے والی وہی ایک ہستی تھی" البتہ تبوک میں وہ نہیں تھی لیکن جو تبوک میں رفاقت نبوت سے محروم کیا گیا۔ سنو! امام بخاری کی زبانی سنو! کہ قلب نبوت نے پھر اس کو کہاں حاضر پایا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ " الا ترضیٰ[2] ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ"۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تبوک کی غیر حاضری کتنی اہم حضوری کی شکل میں بدل دی گئی تھی۔

اب اس کے بعد دیکھو کہ وہ جو عالم قدس سے کعبہ میں آیا۔ اور کعبہ سے دوش اقدس پر آیا۔ وہ رسول کی زندگی کی آخری ساعتوں میں کہاں تھا۔ محمد بن اسحاق راوی ہیں کہ:۔

"علی ابن ابی طالب آپ کو غسل دے رہے تھے۔ اور اُنھیں اپنے سینہ سے لگائے ہوئے کہتے جاتے تھے:۔

" میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ زندگی اور بعد از زندگی۔ ہر وقت آپ کتنے معطر اور خوشبو ہیں"

کیا پوچھتے ہو کہ جو شہادت میں کسی کے ساتھ قبر تک گیا وہ غیب میں اس کے ساتھ کہاں نہیں ہے۔ اندازہ کرو کہ جو رسالت ہی کے گود میں پلا، رسالت ہی کی آغوش میں جس نے پرورش پائی، رسالت ہی کی دعاؤں نے جس کا سینہ کھولا۔ اُسی کی تعلیم و افادہ کا دائرہ اگر سب سے زیادہ وسیع ہو تو کیوں حیرت کی جائے۔ محققین جانتے ہیں کہ اسلام میں فقہ حنفی کا بڑا حصہ سیدنا علی مرتضیٰ پر منتہی ہوتا ہے کیونکہ فقہ ابوحنیفہ کا اصلی سرمایہ وہی علم تھا جو کوفہ میں حضرت سیدنا علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے ذریعہ سے پھیلا

امہات المومنین کی پوری جماعت میں سے صرف حضرت صدیقہ عایشہ ہی سے علم کا وہ ذخیرہ کیوں منقول ہے جو

---

[1] یعنی آج ہمارے ہم پلہ لوگوں کو بھیجو — [2] کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مجھ سے تمھاری وہ نسبت رہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔

دو ہزار دو سو دس حدیثوں کی صورت میں حدیث کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے مقابلہ میں دوسری امہات المومنین سے جو حدیثیں مروی ہیں بمشکل وہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ اس کا سبب وہی ہو کہ "کل میسر لما خلق لہ" ہر شخص کے لئے وہی بات آسان کردی جاتی ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔ اور بلاشبہ حضور فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقربین اصحاب میں سے ہر ایک کے سپرد کچھ فرائض تھے پھر دیکھو کتنی خوبیوں کے ساتھ ہر ایک نے اپنے مفوضہ فرض کو انجام دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ علی نے علم عرفان پھیلایا۔ لیکن دولت۔ سلطنت۔ حکومت امارت کی وسعت کا دائرہ آپ کے عہد میں رُک کر رہگیا۔ یا رک گیا۔ یا روکا گیا۔ جو نا واقف ہیں اس کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسلام کو حکومت کی قوت کی کس حد تک ضرورت تھی اور دولت کس نقطہ پر پہونچ کر دین و تقویٰ کے حق میں زہر بن جاتی تھی۔ ایک عامی دماغ اس کی تہ تک کس طرح پہونچ سکتا ہے؟۔ خضر کی ان مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے کہ کبھی کشتی بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی ضرورت کشتی کے توڑنے ہی سے پوری ہوتی ہے۔ تاہم ان عامیوں سے یہ تو پوچھنا چاہئے کہ عہد صدیقی و خلافت فاروقی۔ دور عثمانی میں حکومت کے دائرہ کو جن طاقتوں نے وسیع کیا تھا۔ ان طاقتوں کا مہیا کرنے والا کون تھا؟ اگر بدر نہ ہوتا تو یرموک کا نظارہ کون دیکھ سکتا تھا۔ اور خیبر نہ کھلتا تو کیا مدائن کھولا جاسکتا تھا؟ کیسے عجیب لوگ ہیں جب آخر کو دیکھتے ہیں تو اول سے نابینا ہو جاتے ہیں اور جب اول کو دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر کو انھوں نے دیکھا ہی نہ تھا۔

سید محمد بادشاہ حسینی قادری (حیدر آبادی)
معتمد مجلس علماء دکن

مکتوبات نیاز

کی کتابت و طباعت کا کام جنوری کے رسالہ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا لیکن اب پھر شروع کر دیا گیا ہے اور مئی تک اس کی اشاعت کی توقع کی جاتی ہے۔

جن حضرات کی پیشگی رقم وصول ہو گئی ہے وہ مطمئن رہیں کہ کتاب شایع ہوتے ہی ان کے نام روانہ کردی جائے گی۔

بعض حضرات نے بغیر رقم بھیجے ہوئے صرف نام درج کرایا ہے، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ محض نام درج کرا لینا رعایتی قیمت سے فائدہ اٹھانے کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ضرورت ہے کہ دو روپیہ پیشگی رقم بھیجدی جائے۔ ورنہ اشاعت کے بعد ان کو تقریباً اس سے دو چند ادا کرنا پڑے گا۔

غالباً اس کے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں کہ ادب اردو میں یہ مجموعہ کیا چیز ہوگا اور اس سے محروم رہنا، اردو کے اس صنف انشاء سے محروم رہنا ہوگا جس کی نظیر اس وقت تک پیش نہیں کی جاسکتی۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

لفظ امّی کا صحیح مفہوم

(جناب محمد عتیق صدیقی - ہند جدید کلکتہ)

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ:-

(۱) پیغمبر اسلام "اُمّی" تھے اور ان کو مکتب کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

(۲) قرآن کی جامعیت اور بلاغت بے نظیر ہے، دنیا آج تک نہ تو اس کا جواب پیش کر سکی ہے اور نہ مستقبل میں پیش کر سکے گی۔

(۳) اسلام دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے۔ اور مذہب کے لحاظ سے دنیا کو اب کسی دوسرے مذہب کی ضرورت نہیں۔

عام مسلمانوں کو تو جانے دیجیے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن "آسمانی" کتاب ہے اور اسلام "آسمانی" مذہب، جس کو خدا نے جبریل کے ذریعہ محمدؐ پر نازل کیا وہ مسلمان (جن کو "علمار کرام" ملحد بے دین، لامذہب اور خدا جانے کیا کیا لقب دیتے ہیں) جن کا عقیدہ عام مسلمانوں کے برعکس ہے ان کے دماغ میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کتاب اسقدر بلند پایہ اور جو مذہب اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مُرتب کی علمیت کا درجہ کتنا بلند ہوگا، لیکن اس خیال کی تائید کے لئے جب اوراق تاریخ اُلٹے جاتے ہیں تو وہاں پیغمبر اسلام "اُمّی" نظر آتے ہیں۔ جو یقیناً غلط ہے۔

کیا آپ مہربانی فرما کر اس مسئلہ پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ نیز اس سوال کے متعلق اپنی ذاتی رائے سے بھی مطلع فرمائیے۔

(نگار) قرآن بہ لحاظ تعلیم اخلاق یقیناً جامع و مکمل چیز ہے اور انشار کے لحاظ سے بھی وہ عربی زبان میں اعجازی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح اسلام کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے بشرطیکہ آپ اسکی اصل روح و تعلیم کو سمجھ کر اس پر

عمل کیا جائے۔ رہ گیا رسول اللہ کا امی ہونا سو اس کے متعلق بیشک گفتگو ہو سکتی ہے۔ اگر امی کے معنے یہ لئے جائیں کہ انھوں نے باقاعدہ کسی مکتب میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور علوم و فنون کا انھوں نے اکتساب نہ کیا تھا، تو میں کیا، کسی کو بھی اس میں کلام نہیں ہو سکتا، کیونکہ واقعی آپ کو کبھی اس کا موقعہ نہ ملا تھا، جیسا کہ خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۸:-

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک

(یعنی اس سے قبل تو نے کوئی کتاب نہ پڑھی نہ لکھی)

الغرض قبل نزول وحی تو آپ کا نوشت و خواند سے ناواقف ہونا مسلم ہے، لیکن بعثت کے بعد اس باب میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ بعثت کے بعد آپ نے معمولی نوشت و خواند سے واقفیت حاصل کر لی تھی، کیونکہ بعض تاریخی روایات سے آپ کا خود بعض مکاتیب کو لکھنا اور پڑھنا ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ آپ نے علوم و فنون حاصل کر لئے تھے پس ظاہر ہے کہ ایسی معمولی واقفیت نوشت و خواند کی ایک انسان کو صحیح معنے میں تعلیم یافتہ یا عالم کہلائے جانے کا مستحق نہیں بنا سکتی۔

لفظ امی کے اشتقاق کے متعلق بھی لوگوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ام القریٰ سے لیا گیا ہے جو مکہ کا دوسرا نام ہے، بعض اسے لفظ امت سے ماخوذ بتاتے ہیں، اور بعض اس کا ماخذ عبرانی لفظ امّوت بتاتے ہیں جس کے معنی بت پرست کے ہیں اور چونکہ یہود عربوں کو بت پرست جان کر اس لفظ سے یاد کرتے تھے اس لئے اپنے آپ کو غیر یہودی یا عرب ظاہر کرنے کے لئے وہی لفظ رسول اللہ نے بھی اختیار کر لیا۔

کلام مجید میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ایسے ایسے محل پر استعمال ہوا ہے کہ ہم کوئی ایک مخصوص معنی اسکے متعین نہیں کر سکتے

آل عمران کی اُنیسویں آیت ہے:-

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم

(اہل کتاب اور اُمیین سے پوچھو کہ کیا تم اسلام لے آئے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ امیین سے مراد غیر اہل کتاب ہیں۔

اسی سورت کی آیت ۷۴ سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:-

ومن اہل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یودہ الیک ومنہم من ان تامنہ بدینار لا یودہ الیک الا مادمت علیہ قائما۔ ذلک بانہم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل۔

مفہوم یہ ہے کہ بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انھیں دولت کا انبار سپرد کر دو تو وہ اسے واپس کر دیں گے، بعض

ایسے ہیں کہ ایک دینار کی امانت بھی واپس نہ کریں اگر انھیں مجبور نہ کیا جائے اور یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک امیئین کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ان کے باب میں کسی سے کوئی باز پرس ہو۔

لیکن سورۂ بقر کی آیت ۷۸ میں یہی لفظ اُن یہودیوں کے لئے بھی آیا ہے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے :۔

ومنہم امیّون لایعلمون الکتاب الا امانی ۔۔۔ یعنی یہود میں سے بعض ایسے اُمّی بھی ہیں جنھیں کتاب کا کوئی علم نہیں اور ہے تو غلط سلط۔ سورۂ جمعہ، اور سورۂ الاعراف کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اُمّی صرف عربوں کے لئے استعمال ہوا ہے مثلاً:۔

(۱) ہو الذی بعث فی الامیین رسولا یتلوا علیہ آیاتہ

(۲) الذین یتبعون الرسول النبی الامی

(۳) فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی

پہلی آیت میں امیئین سے مراد اہل عرب ہیں اور دوسری تیسری آیت میں لفظ اُمّی نبی کی صفت واقع ہوا ہے جسکے معنے خواہ غیر یہود کے لئے جائیں یا غیر تعلیم یافتہ کے۔

اس میں شک نہیں کہ بعثت نبوی کے وقت جتنی قومیں عرب میں پائی جاتی تھیں ان میں کفار عرب ہی غیر اہل کتاب تھے اور اس لئے یہود و نصاریٰ نے جو صاحب کتاب تھے ان کو تحقیراً لفظ اُمّی سے خطاب کرنا شروع کیا جس کے اصلی معنی میں بے پڑھے لکھے ہونا کا مفہوم یقیناً شامل ہے۔

بہرحال رسول اللہ کا بے پڑھا لکھا ہونا ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اب رہا آپ کا یہ خدشہ کہ۔

"جو کتاب اسقدر بلند پایہ اور جو مذہب اس قدر برتر ہو اس کتاب کے مصنف اور اس مذہب کے مرتب کی علمیت کا درجہ بہت بلند ہونا چاہئے ۔ سو اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ جس حد تک مذہب و تعلیمات مذہب کا تعلق ہے، ایک نبی یا رسول کا علوم ظاہری سے آگاہ ہونا بالکل غیر ضروری ہے۔ قرآن نہ فلسفہ سے بحث کرتا ہے نہ طبیعیات سے، نہ علم الکیمیا سے اس کو کوئی واسطہ ہے نہ فلکیات سے۔ وہ صرف اخلاق و تمدن کا درس دیتا ہے اور اس لئے رسول کا مرتبہ صرف اخلاقی حیثیت سے بہت بلند ہونا چاہئے، سو تھا۔

انسان بہ لحاظ فطرت دو قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک وہ جو دماغی حیثیت سے معمولی فہم و ذکا رکھتا ہے اور دوسرا وہ جسکا دماغ کسی خاص ذوق کے لئے غیر معمولی طور پر مناسب و موزوں واقع ہوتا ہے، اور اگر ایک رسول کو ہم دوسرے قسم کے انسانوں میں شمار کریں (اور یقیناً شمار کرنا پڑے گا) تو ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ فطرت کی طرف سے خاص اہلیت اصلاح اخلاق کی لیکر آیا ہے اور یہ ذوق وہ ہے جس کے لئے کسی اکتساب کی ضرورت نہیں، اب رہا کلام مجید کا بہ لحاظ انشا پردازی اعجاز کی حد تک پہونچنا، سو اس کے لئے بھی تعلیم کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اہل عرب میں بڑے بڑے خطیب و شعرا سب

بے پڑھے لکھے تھے اور قوت بیان کا ملکہ ان میں فطری طور پر پایا جاتا تھا۔ اگر کلام مجید کو اس معنی میں خدا کا کلام یا الہامی کتاب نہ مانا جائے جس معنی میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، تو بھی اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تسلیم کرنے میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں، کیونکہ رسول اللہ نہ صرف یہ کہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے، جہاں "سبعات معلقہ" کے شعراء نے جنم لیا تھا بلکہ ایک ایسے قبیلے اور گھرانے کے فرزند تھے جو یوں بھی ہمیشہ افصح العرب مانا جاتا تھا۔

بہر حال ایک پیغمبر کا علوم ظاہری سے واقف ہونا اس کے منصب کے لحاظ سے بالکل غیر ضروری ہے اور اگر زبان و انشاء کی حیثیت سے وہ کوئی چیز ایسی پیش کرتا ہے جو عقل انسانی کو حیرت میں ڈالدینے والی ہے تو اس کا تعلق صرف اس اہلیت سے ہے جسے وہ آفرینش کی طرف سے لیکر آتا ہے اور جو اکتساب و تعلیم سے یکسر بے بنیاد ہے۔

سرمہ - کاجل - چورن منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے۔

کاجل - آشوب سرخی ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہو قیمت عہ

سرمہ - یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا دھند موتیابند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ عہ علاوہ محصول۔

چورن - یہ وہ اکسیر چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستوں کا آنا سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔

منجن - اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبہ آٹھ تولہ عہ علاوہ محصول۔

نوٹ: - سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

پتہ :- م بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

دلچسپ افسانے مجموعہ ہے جناب کوثر چاندپوری کے ۲۵ افسانوں کا جو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحات پر شایع کیا گیا ہے۔ جناب کوثر کے افسانوں کا ایک مجموعہ "دلگداز افسانے" کے نام سے پہلے بھی شایع ہو چکا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ دوسرا مجموعہ شایع کرنے کی ہمت اُسی وقت ہو سکتی تھی جب پہلا ملک میں مقبول ہو چکا ہو۔

افسوس ہے کہ مجھے ان افسانوں کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا، لیکن سرسری تبصرہ کی غرض سے سرسری طور پر ورق گردانی سے میں اس نتیجہ تک ضرور پہونچا ہوں کہ کوثر صاحب جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں، پلاٹ بھی دلچسپ پیدا کرتے ہیں اور آخر میں کوئی معقول نتیجہ بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ زبان و انشا کی دلچسپیاں بھی اکثر جگہ نظر آتی ہیں اور سیرت نگاری کے سلسلہ میں جزئیات کے استقصار کو بھی وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ طباعت و کتابت نہایت اچھی ہے اور قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- شمیم اختر — بیگم گنج — بھوپال۔

مقصود حیات جناب حافظ غازیپوری کی کاوش دماغ کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے، راجہ رام کالج کوٹاپور کے پروفیسر مسٹر بھاگڈے کی کتاب (Sexual problem in India) سے ماخوذ ہے۔ اس رسالہ کا موضوع "جنسیات" ہے جس کی طرف اُردو زبان کے مصنفین نے اسوقت تک بہت کم توجہ کی ہے۔ شادی بیاہ کا مسئلہ معاشرت کا اساسی مسئلہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس کی اہمیت کا اندازہ نہ علماء مذہب نے کیا نہ قائدین ملک و ملت نے۔

اس کتاب میں اسی مسئلہ پر نہایت ہی پاکیزہ و دلچسپ انداز سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ عورت کا مرتبہ ماں ہونے کی حیثیت سے ملک کی ترقی پر کس حد تک موثر ہوتا ہے اور نکاح و ازدواج کی وہ کیا صورتیں ہیں جن میں عورت کی اس حیثیت کو نظرانداز کر کے ناقابل و نالایق افراد کا اضافہ ملک کی آبادی میں کیا جاتا ہے۔

اس رسالہ میں شادی کے موجودہ طریقوں پر بحث کر کے اس کے اصلاح کی ترکیب بھی بتائی گئی ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اگر ملک اس پر عمل کرنے کے لئے طیار ہو جائے تو نصف صدی میں وہ خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ سکتا ہے۔

زبان و انشاء کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں کیونکہ جناب حافظ غازیپوری اپنے ذوق ادب کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں اپنے اس ذوق کی رعایت کا پورا ثبوت دیا ہے۔ مجلد نسخہ کی

قیمت بارہ آنے اور غیر مجلد کی نو آنے ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔

جناب حافظ غازیپوری۔ اندرون حسن منزل۔ الہ آباد

لال قلعہ کی ایک جھلک سید ناصر نذیر فراق دہلوی (مرحوم) کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار شاہ ابوظفر کے زمانہ میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی اور اُس انتہائی انحطاط کے زمانہ میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا۔ سید ناصر نذیر فراق، دہلی کے مشہور انشاپرداز تھے۔ اور اس اسکول کے لوگوں میں سے تھے جس کا اب ایک فرد بھی باقی نہیں۔ زبان کی حلاوت، انداز بیان کی شیرینی، اُردوے معلے کے ٹکسالی محاورے، تہذیب قدیم کے عوائد و مراسم کا بیان، الغرض اس چھوٹی سی کتاب میں وہ کیا چیز نہیں ہے جس سے اس وقت انشاء کی بڑی سی بڑی کتاب خالی نظر آتی ہے۔ میں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں جب تک وہ ختم نہیں ہوگئی۔ اور جب ختم کر چکا تو تاثر کا یہ عالم تھا کہ آنکھ اور دل دونوں رو رہے تھے۔

مسٹر شاہد احمد اڈیٹر ساقی کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ ملفوظات یکجا کر کے مرحوم ناصر نذیر فراق کی موت کو ہم لوگوں کے لئے آسان بنا دیا۔ قیمت ۱۲ ہے اور ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

راسپوٹین گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں راسپوٹین نے سلطنت روس کی تباہکاری میں جتنا خاموش لیکن عظیم حصہ لیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ یہ بظاہر صوفی و راہب تھا، لیکن اپنے اعمال و افعال کے لحاظ سے اتنا زبردست شیطان تھا کہ شاید ہی اسوقت ہندوستان کا کوئی بڑے سے بڑا مکار و شعبدہ باز صوفی اس کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ راسپوٹین نے شہنشاہ روس اور اسکی بیگم پر اپنی شعبدہ کاریوں سے اتنا گہرا اثر قایم کر لیا تھا کہ خلوت و جلوت کی کوئی تفریق اسکے لئے باقی نہ رہی تھی اور ایوان شاہی کی ہر بلند بالا نوجوان لڑکی اس کے شبستان عیش کی شمع دل افروز نظر آتی تھی۔

اسی خوش نصیب شیطان کے حالات ہیں جو راسپوٹین کے نام سے پہلے کلکتہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار ہند میں بالاقساط شایع ہوتے رہے اور اب کتابی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ زبان و انشا، کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام ان کے محاسن کی کافی ضمانت ہے۔ یہ رسالہ ۸ر میں دفتر اخبار ہند کلکتہ سے ملسکتا ہے۔

رہنمائے انجکشن ڈاکٹر مختار احمد صاحب ممتاز لاہوری کی تصنیف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انجکشن دینے کے کتنے طریقے ہیں، کس حالت میں، کہاں اور کیونکر انجکشن دینا چاہئے، مختلف امراض میں کون کونسی دوائیں کن حالتوں میں انجکشن کے لئے انتخاب کرنا چاہئے۔ کتاب فی الجملہ مفید ہے، اور وہ لوگ بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو باقاعدہ ڈاکٹر تو نہیں ہیں لیکن ڈاکٹری معلومات انھیں حاصل ہیں۔ یہ کتاب کتب خانہ طب جدید میو روڈ لاہور سے ۱۲ر میں ملسکتی ہے۔

یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مارچ ۳۴ء کے نگار میں ہمارے فاضل دوست مسٹر اختر حسین بی۔ اے رائے پوری کا ایک مضمون "زبان بے زبانی" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، جس میں ایک درخت (برگد) کی زبان سے جذبۂ محبت کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی ۔۔۔ یہ داستان بھی اسی قسم کی ہے لیکن اُس بُت کی زبانی ہے جو اس برگد کے سایہ میں پڑا ہوا تھا۔ اس مقالہ کا موضوع یہ دکھانا ہے کہ ایک عورت اپنی فطرت کے لحاظ سے اتنی کمزور نہیں ہے جتنی اپنے ماحول کے لحاظ سے ہے۔ اور جس وقت اس کے سامنے روایاتِ خاندانی اور تقاضائے محبت میں سے کسی ایک چیز کے اختیار کر لینے کا سوال آتا ہے تو وہ کس قدر مجبوری کے عالم میں "پیمانِ وفا" توڑنے پر آمادہ ہوتی ہے ۔۔۔ اختر حسین صاحب ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ خوش قسمتی سے سنسکرت اور بنگلہ زبان کے بھی ماہر ہیں۔ چنانچہ اس مقالہ میں "ذوق و اکتساب" دونوں کے امتزاج کا حُسن آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا۔ نیاز

اے لوگو سُن لو کہ ہر شخص اپنے محبوب کی جان لیتا ہے۔ کوئی تیکھی تیکھی چتونوں سے اور کوئی میٹھی میٹھی باتوں سے۔ بزدل اپنے محبوب کو بوسہ سے قتل کرتا ہے اور بہادر تلوار سے۔ (آسکر وائلڈ)

گاؤں کے لوگوں نے صبح اُٹھ کر دیکھا کہ رات کے طوفان میں برگد کا درخت امربیل کو لئے ہوئے زمین پر گر پڑا ہے۔ بجلی اُس کے تنے میں ایک سیاہ تیر کی طرح پیوست ہو کر زمین میں غائب ہو گئی ہے۔ آشیانوں کے تنکے پرندوں کے بال و پر میں اُلجھ کر ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے آسمان سے نکالا ہوا فرشتہ ستاروں کی انجمن سے مشتری کو اُٹھا لایا ہو اُس کے تعاقب میں بجلیاں جھپٹی ہوں اور وہ بیدم ہو کر گر پڑا ہو۔ چبوترے کے خرابے میں ایک طرف میں سرنگوں پڑا ہوا ہوں، کل تک میں گنگا جل سے نہلایا جاتا تھا، چندن اور سیندور سے سنوارا جاتا تھا۔ صبح کے وقت کنول کے ڈنٹھل سے بھی زیادہ نازک انگلیاں پھولوں کی چادر مجھے اُڑھاتیں اور سرِ شام میرے ارد گرد کے چراغ حُسن، محبت کی لو بھڑکائے ہوئے حصول آرزو کی دعائیں مانگتے۔ گویا حسن کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا اور منجمد ہو کر مورت بن گیا۔ میرے سینہ میں اس جھلسے ہوئے پیڑ اور مرجھائی ہوئی بیل کی کہانی دفن ہے۔ حالانکہ یہ مورت عورت کے دل سے زیادہ دلچسپ اور مرد کے دل سے زیادہ نازک ہے، مگر اس کی زبان و عبارت کو سمجھنے کے لئے ہوشیاری کی نہیں بیہوشی کی، فہم کی نہیں جنون کی ضرورت ہے۔ جب زمین ماضی کے خواب

دیکھتے دیکھتے بڑبڑانے لگتی ہے اور اس کی ڈوبی ہوئی آواز کی بازگشت جھرنوں کے ترنم اور چنار کے پتوں کی سرسراہٹ میں سنائی دیتی ہے، جب وقت گردشِ ایام کی داستان قلم شفق سے لکھنے کے لئے شب کی سیاہی گھولتا ہے تو انسان اور بوم کے سوا ہر ذی حیات اُس کا ہمنوا اور ہمگوش ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے میں 'باغ و بہار' کے اُس شہزادے کا بت ہوں جسے جادوگر نے پتھر بنا دیا تھا۔ کیا عجب کہ میں اس عشوہ فروش 'انسویا' کی صورت ہوں جسے اس کے شوہر کی بددعا نے سنگ جامد بنا دیا تھا۔ کیا ہو سکتا ہے کہ مجھ میں الف لیلہ کی اس دکھیاری شہزادی کی جان ہو جس کا آدھا دھڑ پتھر کا تھا۔ پھر کوئی غزنوی مجھے سومنات کا بت سمجھ کر مسجد کی سیڑھیوں پر چُننے کا اصرار کیوں کرے؟ گاؤں کے معمار کیوں مجھے اپنے مشقِ ستم کا ہدف بنائیں؟ کوئی چشمِ عبرت سے دیکھے کہ میرے سنگ ریزوں میں وہ چنگاریاں مضمر ہیں جو ان سیڑھیوں کو جلا دیں گی، ان پیروں میں آبلے ڈال دیں گی۔ ماضی کی یاد میں اس زخم نصیب بت کو یونہی سوگوارِ ماتم رہنے دو۔ دھوپ، پانی اور پالے میں پڑا پڑا وہ کچھ عرصہ کے بعد مٹی میں مل جائے گا۔ رگ رگ میں پہونچی تو رفتہ رفتہ اس کی گرمی کم ہوتی جائے گی اور ایک دن وہ آئے گا جب سنگ تراش اسے کاٹ کر کسی دہلیز پر ڈال دیگا۔

جب جانوروں کا مکروہ شور و شغب تھم جاتا ہے اور لیلیٰ شب کے رباب کو چاند کی کرنیں چھیڑنے لگتی ہیں، جب شمیم نم شب کی چھیڑ سے تنگ آ کر رات کی کلی اپنا لاجوردی گھونگھٹ ہٹا کر لجائی ہوئی چتونوں سے شبنم کو دست درازی کی دعوت دیتی ہے۔ جب محبت کا دیوتا صوفی کے حجرہ میں شیطان کا غلبہ اور والدین کے گھروں میں بہرام بن کر داخل ہوتا ہے۔

تو یکایک محسوس ہوتا ہے کہ میرے سنگین جسم کی ایک ایک تہہ کتاب زندگانی کا ایک ایک ورق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں انگڑائی لیتا ہوا اُٹھوں اور دُنیا سے کہوں کہ بے زبان پتھروں میں بھی جان ہے۔ پجاریوں کا ہجوم کس خلوص سے میری منتیں کرتا رہا ہے۔ کتنے لوگوں کو میرے آگے عرض مدعا کر کے سکون و قرار حاصل ہوا ہے۔ کاش جیسے ہی کوئی ناکتخدا لڑکی میرے حضور میں اپنی تمنائیں پیش کرے، جیسے ہی ٹھکرائے ہوئے ارمان اور کچلی ہوئی آرزوئیں زبانِ حال سے فریاد کریں۔۔۔ یک بیک اس ساکت بت میں تھرتھری پیدا ہو، میرا دل دیپک راگ گاتا ہوا دھڑک اُٹھے اور اس کی آگ سب زبان درازوں کو خاک سیاہ کر دے اور محرومِ نطق بے زبانوں کے لئے ایک نیا جلوۂ طور بن جائے۔ ایسا طور جس کی تجلی غیر فانی ہو اور دائم ہو

مجھے اس تصور سے انتہائی اطمینانِ قلب ہوتا ہے کہ جب میرا ایک ایک ریزہ ایک ایک لفظ بن جائے گا اور جب میری گرمی گویائی میں متبدل ہو جائے گی، جب میں دنیا کو بتا سکوں گا کہ انسان کے بہائے ہوئے خون کا سیلاب چٹانوں کی صورت میں جم گیا ہے، جب میں ثابت کر سکوں گا کہ انسان چلتا پھرتا اور بولتا ہوا شہاب ثاقب ہے، جب میں بُت شکنوں سے کہہ سکوں گا کہ ہماری روح کو جسم کی قید سے آزاد کر کے تم نے اپنے دلوں میں بسا لیا ہے۔ تو انسانیت خودکشی کر لیگی! ہاں، اگر انسانیت مرد کے عشق کی طرح بیوفا اور عورت کے وعدوں کی طرح بے اعتبار نہیں ہے تو وہ یقیناً خدا سے کہیگی کہ اپنے عرش کے ساتھ اسی زمین پر اُتر آئے!۔۔۔ مگر معلوم نہیں وہ مبارک ساعت کب آئے۔

دوپہر کو جب گڈریا مجھ پر سر رکھ کر بانسری کی تان چھیڑتا ہے، اور اس کے دلفریب سروں کو سن کر دھوپ سے پریشان پرندے دم بخود رہجاتے اور سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ نغمۂ حیات پہلے کب سُنا تھا، یا جب کوئی دیہاتی برات میرے گرد و پیش ٹھہرتی ہے اور کوئی معصوم دوشیزہ دوسرے بچھڑوں کے ساتھ چوہے میں مجھے بھی لگا دیتی اور بڑوں کے ڈر سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جھجکتی ہوئی آواز میں پریت کے گیت گاتی ہے یا جب گاؤں کی ننھی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی مجھے آ آکر چھوتی ہیں ـــــ تو میں ان سے کچھ کہنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہوں ۔ مگر جیسے پھانسی کی رسّی کا جھٹکا دمِ واپسیں آخری چیخ کو زبان پر آنے کی اجازت نہ دے، جیسے اوہام کی پابندی کسی دُلہن کی زبان سے بوقت ایجاب و قبول 'نہیں' نہ نکلنے دے ـــــ یہاں ویسے ہی میرے جسمِ لرزاں سے عالمِ نزع کی سی ایک ہچکی نکلتی اور سینہ میں رہجاتی ہے ۔ البتہ جب کبھی کوئی ٹوٹا ہوا ستارہ میرے قریب گر پڑتا اور مجھ سے ہمسخن ہوتا ہے تو آسمان والوں کی داستان سنتے سنتے میں بھی فرطِ اضطرار سے اُسے زمین والوں کی سیاہ کاری سمجھنے لگتا ہوں ۔

بہت دن ہوئے ۔ سورج آہستہ آہستہ اُفق میں غائب ہو رہا تھا، گو یا رات کی ناگن اپنے گوہرِ شب چراغ کو نگل رہی ہو ۔ ہوا ۔ ب ۔ اور من . غزل جھٹک رہی تھی ۔ چراگاہوں سے لوٹتی ہوئی گائیوں کی گھنٹیاں اُنھیں تسلّی دے رہی تھیں کہ یہ قصاب کی چھری کے آرام کا وقت ہے ۔ مجھ پر عبیر مل کر اور میرے سر پر آرتی کا چراغ رکھ کر پجارنیں رخصت ہو چکی میرے سنگین جسم کی جلد پر پروانوں کی تڑپ ایک خفیف سی لرزش پیدا کر رہی تھی ۔ میں ابھی اس سوچ میں غلطاں و پیچاں ہی تھا کہ جگنوؤں میں پتنگوں کے لئے کوئی کشش کیوں نہیں ہے کہ چبوترے پر پیروں کی چاپ سُنائی دی اور میں نے دل کی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ ایک لڑکی پلکوں پر ٹھیرے ہوئے آنسو کی طرح میرے سامنے کھڑی تھرتھرا رہی ہے ۔ اس کا رہ رہ کر دائیں بائیں دیکھنا، اپنی آہٹ سے آپ جھجکنا، موسم کی خنکی کے باوجود بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھنا، پلّو کو سمیٹتے سمیٹتے یک بیک کانپ اُٹھنا ۔ یہ سب باتیں اس کی انتہائی بےچینی کا ثبوت دے رہی تھیں ۔ اس نے ڈرتے ڈرتے میرے آگے سر جھکایا اور درخت کا سہارا لیکر سہمی ہوئی بیٹھ گئی اور معلوم نہیں کس کا انتظار کرنے لگی ۔

اپنے کو خدا سمجھنے کے فریب میں میں اتنے عرصہ تک مبتلا رہ چکا تھا کہ اب دوسروں کے محسوسات کو من و عن سمجھ سکتا تھا ۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس سرزمین پر عبادتگاہ ہی ایک ایسی جگہ کیوں ہے جہاں دو چاہنے والے مل سکتے ہیں مگر دیکھتا آیا ہوں کہ یونہی ہوتا ہے ۔ ایسے واقعات سے مجھے چنداں دلچسپی نہیں لیکن اس دوشیزہ کے اضطراب میں ایک عجیب کیفیت تھی ۔ شوقِ ملاقات سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، نبض وجد کرنے لگتی ہے ۔ خون کو کوئی پنکھا سا جھل جاتا ہے ۔ میں اس ولولہ کو سمجھ سکتا تھا ۔ لیکن اس بیچاری کا دل بیٹھا کیوں جا رہا تھا ۔ سانس کی جگہ ہچکیوں نے کیوں لے لی تھی ؟ اس راز کا پتہ چلانے کے لئے میں اس کی روح سے ہم آہنگ ہو گیا ۔

ایک گھونسلے میں شاما کا بچہ کنمنایا اور ماں نے اپنے پروں سے اُسے تھپک کر سلا دیا۔ لڑکی نے آبدیدہ ہوکر اوپر دیکھا اور سوچنے لگی۔ "آج دلارے، کو نیند کیسے آئے گی۔ اس کے پالنے کو اماں جھلائیں یا ننھی رجنی مگر وہ سوتا کب ہے۔ ہر شام کی طرح آج بھی وہ کالج سے میری واپسی کا منتظر ہوگا۔ جب تک میں پاس بیٹھ کر لوریاں نہ گاؤں وہ ہرگز نہ سوئیگا۔ اور ہائے میری مینا! جلدی میں اس کی کٹوری میں پانی بھرنا بھی تو یاد نہیں رہا۔ کہیں پیاسی نہ مرجائے۔ اچھا، اسوقت اماں کیا کر رہی ہوں گی۔ ابا کلب سے لوٹے ہوں گے، میرے لئے تصویروں کا البم وہ ضرور لائیں گے۔ اسے اوورکوٹ میں چھپا لیا ہوگا۔ راستہ بھر سوچتے آئیں گے کہ کامنی کو بہت چھیڑوں گا جب وہ بہت رونے کے قریب ہو جائے گی تو دوں گا۔ پھر وہ پگلی خوشی کے مارے ناچنے لگے گی۔ جب اماں کہیں گی کہ اسکول میں ڈرامہ ہے، لڑکی ہجولیوں کے ساتھ گئی ہے، نو بجے لوٹیگی تو ابا کچھ کبیدہ ضرور ہونگے جانے رجنی کیلئے کیا کیا لائے ہوں۔ لو ان کے ستار کے تار اتر گئے تھے، مجھ سے ٹھیک کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور ہاں، شام کو چمیلی میں پانی بھی تو نہیں دیا۔!

یہ پونے آٹھ بجے والی ریل جا رہی ہے۔ یہ نصیبوں جلی داہنی آنکھ رہ رہ کر کیوں پھڑک رہی ہے۔ اب تک راجین کیوں نہیں آیا۔ آتا ہی ہوگا۔ دور سے اُس کی آہٹ کو میں پہچان سکتی ہوں۔ داہنا قدم زور سے، بایاں دھیمے، کتنی بار کہا کہ یوں لڑکھڑاتے نہ چلا کرو مگر وہ کب مانتے ہیں...... رات ہی کو تو گھر بھر میں جاگ پڑ جائے گی۔ ابا کو سرجو سے معلوم ہوجائے گا کہ سب جھوٹ ہے، کالج میں کچھ نہ تھا، کامنی کا پتہ نہیں۔ ابا اماں پر بجلی سی گر جائے گی۔ دیر تک دونوں مبہوت سے رہیں گے اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھیں گے۔ کیا عجب کہ اسی وقت کپڑے پہن کر راجین کے مکان پر آجائیں۔ وہاں میں اُن کا سامنا کس منہ سے کروں گی! نہیں، ہرگز نہیں، میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں وہ زبان سے کچھ نہ کہیں گے مگر میں ان خاموش جھڑکیوں کو جیتے جی کیونکر برداشت کرسکوں گی اور اگر وہ اماں کو بھی ساتھ لے آئے — تب تو میں زندہ نہ ہونگی اوف اوہ اس خیال ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

آپ ہی آپ، وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔ دیوانہ وار درخت سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی۔ پھر جب آنکھوں سے آنسو پونچھ کر انھیں جھٹکا تو دو چار قطرے مجھ پر بھی گر پڑے۔ بس یہ محسوس ہوا کسی نے نشتر لگا دئے۔ اب تک وہاں ٹیس سی اُٹھتی ہے لیکن ساتھ ہی لطف بھی آتا ہے۔ پہلی اور آخری مرتبہ مجھ پر اخلاص کی دو چار بوندیں گریں مگر ان کے آگے گنگا جل کی وہ ساری گگریاں ہیچ ہیں جن سے لوگ گناہ کے دھبے دھونا چاہتے ہیں۔

کیا محبت مجھے یہ قوتِ گویائی بخشے گی کہ میں اُن کے سامنے صرف یہ جملہ کہہ سکوں — ہم دونوں کی زندگی ایک ہے۔ چاند اور چاندنی، پھول اور نکہت تصویر اور رنگت کی طرح ہم الگ نہیں کئے جا سکتے۔ کیا کچھ دیر کے لئے حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر میں یہ کہہ سکوں گی۔ عورت بے زبان تھی کہ کل تک وہ محبت کی توہین کرتی آئی تھی۔ آج وہ خاندان اور سماج کی نہیں محبت کی پرستار ہے۔ وقار اور عصمت کی خاک میں بڑی تلاش کے بعد اسے محبت، کا ہیرا ملا ہے۔ اسے وہ کسی قیمت پر نہ بیچے گی

اب تک اپنے حسن کا عکس وہ بوالہوسی اور خود فریبی کے آئینہ میں دیکھتی آئی ہے۔ آج عشق آزادی کی آرسی لیکر اسکے سامنے آیا ہے، مجھے اپنی صورت اس میں دیکھنے دو۔ ماں کی ممتا اور باپ کی چاہت کی پٹی میری آنکھوں پر نہ باندھو۔ کیا میں یہ سب کہہ سکوں گی؟ — پاس پڑوس کی بوڑھی عورتیں میرے بڑے بول سے حیرت کی پتلیاں بن جائیں گی۔ والدین لعنت ملامت کریں گے، آسمان میں میرے لئے جگہ نہ ہوگی، زمین سونی ہوگی — اور اس خلا میں زندگی کا احساس ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح مدد کا طلبگار ہوگا۔ کیا میں خاندان کے دلدل میں پڑی ہوئی اسے ڈوبتی دیکھوں گی اور کچھ نہ کہوں گی — کیا میری آواز میں اتنی طاقت ہوگی کہ ماں باپ کی گریہ وزاری اور بھائی بہن کی منت سماجت کو بند کردے — اور عشق کی بلندیوں پر چڑھ کر کہے کہ عورت اپنی روح کو پاگئی۔ اس کی خودی اپنے لئے ایک الگ خدا بنائے گی۔ وہ صرف رسمِ الفت کو مانیگی وہ اپنی دنیا الگ بسائے گی۔ اس کے آئین الگ ہوں گے۔ کیا میں یہ سب کہہ سکوں گی؟ — کیا یہ ممکن ہے؟۔

بیجان بتاسے آگے گر کر وہ ایک سانس میں سیکڑوں دعائیں مانگ گئی۔ میرا شہ نشین اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا اس کی ہچکیوں کو سن کر پرندوں کے جوڑے کانپ اٹھے۔ نہ معلوم کیوں انھیں خوشہ ہوا کہ صیاد انھیں الگ کرنا چاہتا ہے۔ اُن کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے فضا دیر تک متلاطم رہی۔ اس درخت پر سب نے بسیرا چھوڑ دیا اور جاکر دوسری ڈالیوں پر بیٹھ گئے۔ پروانوں کو یقین ہوگیا کہ اُن کی وفا اور شمع کی جفا سب فریب ہے۔ دیر تک وہ اسی اُلجھن میں پھنسی رہی۔ گویا اس کی روح ایک دوراہے پر ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی تھی، جہاں سے ایک راستہ خاندان کی طرف اور دوسرا محبت کی طرف جاتا تھا۔ اوہام کے اندھیرے میں اس کی روح بھٹک رہی تھی اور کہیں راستہ نہ ملتا تھا۔ مجھے لوگ خدا سمجھتے تھے اگر انکی دل شکنی کا خیال نہ ہوتا تو میں ہزار زبانوں سے چیخ اُٹھتا کہ 'آئے وہ جو مجھ سے بڑا ہے' اگر تو میری چنگاریوں میں اتنی فراہمی پیدا کردے کہ وہ مشعل راہ بن جائیں اور میں محبت کی پگڈنڈی اسے دکھا سکوں — تو تجھ پر ایمان لے آؤں گا! لیکن یہ نہ ہوا، آہ یہ نہ ہوسکا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، وہ دیا جھلملایا اور تاریکی کو زیادہ اندوہ فزا بنا کر گل ہوگیا۔

"پرسوں ہولی ہے۔ کل شام کو ماموں گیا سے آئیں گی۔ آنندو بھی ہوگی۔ اس سے ملے اب تین — تین کیوں پورے چار سال ہو گئے کہا ہو تمہارے لئے آسام سے ایسی ایسی چیزیں لائی ہوں کہ مرتے دم وصیت کر جاؤ کہ میری جان کے ساتھ ہیں اسلئے یہ بھی میرے ساتھ جلادی جائیں! اتنی باتیں کہیں گی۔ اور بڑی بھوجی تو آئیں گی۔ کتنا لطف آئے گا، کیسے جلسے ہوں گے! آج ابا سے کہنا بھول گئی کہ چھوٹے سے لئے ڈور منگوائیں اور ان پرانی پچکاریوں سے کیا ہوگا۔ میں تو اپنی سہیلیوں سے یوں رنگ نہ کھیلوں گی۔ اور ٹھیر داماں کے کان اُمیٹھوں گی کہ دولہا گھر لے آئی اور ہمیں پوچھا تک نہیں۔ سچ، میں تو اماں سے کہدوں گی کہ بوڑھوں کا جمگھٹ الگ ہو، کوئی تماشا بھی ہو۔"

طرب و نشاط کے اس تصور سے اس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ آنکھوں نے مسکرا کر آنسوؤں کی نمی کو گالوں پر خشک کردیا۔ خوشی کے مارے اس نادان کی مٹھیاں بندھ گئیں۔ بچپن کی سکھیوں اور عزیز داروں کو سوچتے سوچتے کبھی وہ آنکھیں بند کرلیتی

کبھی زیر لب مسکراتی اور چبوترے پر بکھری ہوئی پتیوں کو ہتیلی پر ملنے لگتی تھی۔ مگر چشم زدن میں یہ مسرت کافور ہو گئی، جیسے نفیر صبح پر کلی لبیک کہنے بھی نہ پائے اور مالی اسے توڑ لے جیسے محتسب کی دوڑ سے میخانہ میں ماتم بپا ہو جائے۔ "نہیں یہ سب میرے لئے نہیں ہے۔ جب یہ قصہ انھیں معلوم ہوگا تو میں ان کی نظروں میں کتنی گر جاؤں گی۔ میرا نام آتے ہی وہ سب حقارت سے منھ پھیر لیں گی۔ میرا ذکر تک گوارا نہ ہوگا۔ مجھے دیکھتے ہی اُستانیوں کے ہاتھ بد دعا کے لئے اُٹھ جائیں گے۔ بھولے بھٹکے میں کہیں سامنے آ گئی تو وہ سب سر جھکا لیں گی گویا میری بیحیائی پر ان کی حیا رو رہی ہو۔ ابّا اور امّاں بھول جائیں گے کہ ان کی ایک بیٹی اور بھی ہے۔ محلے والے سرگوشیاں کریں گے، بھابھی ناک پر اُنگلی رکھیں گی، بھائی جان جنتری میں قیامت کی تاریخ ڈھونڈیں گے —— اور میرا گناہ؟ میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے کیوں دیکھا اور اپنے دل سے کیوں مشورہ کیا۔ کیوں نہ شادی کے بازار میں والدین کے منھ بولے دام پر اپنے کو بک جانے دیا۔ کیا ان کلفتوں کو دیکھ سُن کر میں زندہ رہ سکوں گی؟ آگ لگے اس محبت کو۔ کیا واقعی میں راجیندر کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی؟ —— نہیں ...... یہ سوال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا ....."

میں نے دیکھا کہ یہ وسوسہ اس کی روح میں ایک گتھی ڈال گیا۔ اس کی رگ رگ میں اس کشمکش کی وجہ سے اینٹھن سی ہونے لگی۔ درد و کرب کا یہ عالم میں نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ بار بار وہ اپنی ساری کا سرا گلے میں ڈال کر اسے گھونٹنے کی کوششِ رائگاں کرنے لگی۔ آپ اپنے کو اذیت دینے کے لئے دانت کچکچا کر آنسوؤں کو ضبط کرتی، سانس روک کر ہچکیوں کو مسوس دیتی۔ ابھی وہ اسی بےبسی کی حالت میں تھی کہ سامنے ٹارچ کی روشنی دکھلائی دی اور کسی کی بیقرار آواز نے پوچھا "کامنی، کامنی۔ مگر وہ لڑکی یوں بے حرکت اور ساکت بیٹھی رہی، کہ مجھے شبہ ہونے لگا آیا میں زیادہ بےجس ہوں یا وہ۔

نوجوان چبوترے پر چڑھ آیا اور اس کا نام لیکر متواتر پکارتا رہا مگر لڑکی خاموش رہی۔ پھر وہ قریب آیا اُسے ہاتھ کا سہارا دیکر کھڑا کیا اور ستاروں کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں غور سے اُس کے چہرے کو دیکھا اور یہ کہتے ہوئے "آخر یوں چپ کیوں ہو" اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دئے۔

اس سے پہلے میں کئی بار دیکھ چکا تھا کہ عشق کی اُنگلیاں جب پہلے پہل بوسہ کے مضراب سے ربابِ حسن کے تاروں کو چھیڑتی ہیں تو کیسے راگ پیدا ہوتے ہیں۔ ایڑی سے لیکر چوٹی تک ایک تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے جیسے کسی نے بجلی کا تار رکھ دیا ہو، جیسے تتلی پھول پر بیٹھی ہو اور اس کے رنگین بازو پنکھڑیوں پر چپک گئے ہوں، جیسے بھونرا کنول کے پھول پر بیٹھا ہو، پتیاں سکڑ گئی ہوں اور وہ باہر نکلنا چاہتا ہو کہ دوبارہ گرفتار ہو —— ایک بے پیئے کی مستی —— وہ پہلا پیار. مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ آخری بوسہ کیا ہوتا ہے۔ جیسے محبوب کی مردہ لاش سے کوئی لپٹ جائے اور یہ سوچے کہ میری التجا اس کی آنکھ کھول دے گی، جیسے خواب سے جاگ کر کوئی پھر آنکھیں بند کر لے اس توقع پر کہ میں پھر اس جہانِ جمیل کی سیر کر سکوں گا، جیسے بچہ کھلونوں کو توڑ کر رونے لگے کہ اس کے آنسو ان ٹکڑوں کو یکجا کر دیں گے —— بس اسی طرح

اس لڑکی کی روح نیم جاں ہوکر اس کے بے رنگ و بو لبوں پر تڑپ رہی تھی اور اس نوجوان کی روح اُسے پکار رہی تھی۔۔ اُٹھ کہ میں تیرے لئے پیامِ حیات لائی ہوں، مجھے پہچان کہ میں تیری آواز کی بازگشت ہوں۔

آسمان پر ستارے آپس میں ٹکرانے لگے، پتیاں بل بل کر رونے لگیں، جگنو چشم زدن میں بینوا ہو گئے اور جب راجین نے اس کی باہیں چھوڑ دیں تو اُسے محسوس ہوا کہ زندگی میں کچھ کمی سی آگئی ہے۔

لڑکی نے جب اوسان سنبھالے تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ گہری نیند سے جاگی ہے۔۔ اتنی گہری اور لانبی نیند کہ اس بیچ میں ایک جادو کی چھڑی نے سب کچھ بدل دیا ہے۔ اسے یہ معلوم ہوا کہ دماغ کی روشنیاں اور دل کے کھنڈروں میں کوئی لاش کو گھسیٹ رہا ہے۔ راجین کی آواز پر اسے شبہ ہونے لگا کہ دور سے کوئی اجنبی کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یاد دلا رہا ہے۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا۔۔ جب اس کی رنگین بیانی نے عشق کی ایک ایسی بستی بسا دی جس میں خود فراموشی، بیخودی اور سرشاری کے سوا کچھ نہ تھا، تو وہ چونک پڑی، اپنے کو سنبھالا اور بالوں کو سلجھاتی ہوئی بولی۔۔ نہیں نہیں، تمھیں دھوکا ہوا۔ میں تو تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ وہ کامنی مرچکی، اُسے بھول جاؤ وہ خاندان کے قفس میں رہتی آئی تھی، وہ اپنی بولی بھول چکی تھی۔ اُسے پرواز و رفعت کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ ماں اور باپ مقراض کے دو پہلو تھے جو اس کے پروں کو کتر دیتے تھے۔ ایک دن کسی جلبس بمیایہ کی طرح یہ پنجرہ ایک چڑیمار کے گھر منتقل ہو جائے گا جسے عرفِ عام میں شوہر کہتے ہیں۔ یہاں تو ایک دن تم قفس کی تیلیوں کے قریب آئے اور تمھارے آزاد نغموں نے میری خودی کی راکھ سے اُس موسیقار کو زندہ کیا جو میری روح ہے اور جو میری لاعلمی میں ہمیشہ دبی رہی تھی۔ میں بھی اس قید سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ اُٹھی اور اس حد تک کہ زمین و آسمان کی تیلیوں کو بھی توڑ دوں۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ موسیقار جب نغمہ آفریں ہوگا تو مردہ کی ہنگامہ آرائیاں سکتہ میں آجائیں گی۔ وہ نادم ہوگا کہ اسکی زندگی کے تار کتنے بیربط اور اُلجھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن ہائے ری، میری خود فریبی! میں نے قفس سے نکل کر دیکھا کہ میری روح ایک چمگادڑ تھی جو خاندان کے تاریک کونے میں ہی زندہ رہ سکتی تھی۔ روشنی میں آتے ہی اس کا دم اُلجھا اور وہ فضا میں اُلٹی اُڑنے لگی۔ مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔ ابھی اس پرندہ میں کوئل اور پپیہے کی سی خودداری پیدا نہیں ہوئی کہ صیاد اسے دام میں لاتے ہوئے گھبرائے۔ ممکن ہے کہ کبھی ایسا ہو سکے لیکن ابھی نہیں۔

میں پھر اُسی غلام گردش میں جاکر اپنے کو پابہ زنجیر کرنا چاہتی ہوں۔ کل خاندان شادی کے بازار میں اس باندی کا نیلام کرے گا۔ بہت سے سوداگر میری خرید کے لئے آئیں گے۔ میرے والدین انھیں روپیوں کی تھیلیوں میں بند کرکے وقار کے ترازو پر تولیں گے اور جو سب سے بوجھل ہوگا میں اُن کے سپرد کر دی جاؤں گی۔۔۔ کیا تم بھی اس نیلام میں بولی بولو گے؟ اگر آؤ تو سودے کے لئے تیار ہو کر آنا۔ مجھے وہیں پہونچا دو، جہاں سے

محبت کا مقناطیس مجھے کھینچ لایا تھا، کہیں میں زندگی کے میلے میں کھو نہ جاؤں۔

رقت سے اُسکے الفاظ گلے میں نوائے سوختہ بن کر رہ گئے اور تھوڑی دیر تک اس کے حواس کشمکش میں مبتلا رہے کہ جاگیں یا سوئیں۔ میں اس محشرِ جذبات میں گم سم سا ہو گیا۔ فریبِ کائنات کا ایسا منظر پہلے نظر سے نہ گزرا تھا۔ جی چاہا کہ شہ نشین سے نیچے لڑھک پڑوں اور میرے جسم کا ہر ذرہ آنسو بن کر بہہ جائے۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ نوجوان نے بغیر کچھ کہے سنے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے لئے ہوئے چپ چاپ اس طرف چل دیا جدھر سے وہ آئی تھی۔ اس لڑکی سے تو وہ کچھ نہ بولا مگر چلتے چلتے مجھے ایک ٹھوکر لگا گیا۔ ہلکی سی ٹھوکر مگر ایسی کہ میرے دل و جگر الگ الگ ہو گئے۔ شاید چاند کے دل کا داغ ایسی ہی کسی ٹھوکر کا نقشِ پا ہے۔ شاید ایسی ہی ٹھوکروں سے سورج گہن میں آجاتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اسے دعا دوں یا بد دعا! جب اس نے کبھی مجھے دیوتا سمجھ کر حصولِ ارمان کی منت نہیں کی تو اس ناکامی کے بعد مجھے ٹھوکر لگانے کا اسے کیا حق تھا! — کہہ نہیں سکتا، مگر اس خاکِ جبیں کے ذرات مجھے کہتے ہیں کہ ایسی ہی ٹھوکروں سے بےحس دیوتاؤں میں جان پڑتی ہے۔

جب صبح ہوئی اور عبادت گزاروں نے مجھے بنایا سنوارا تو میں سوچنے لگا کہ کہیں پتھر سے موم تو نہیں ہو گیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر مجھ میں ایک عجیب تغیر ہو گیا — ایسا کہ دھوپ میں سردی سے کانپنے لگتا اور رات کی نمی میرے لئے آگ بن جاتی۔ یہ تو تھا ہی، ساتھ ہی ساتھ جہاں آنسو کے دو قطرے گرے تھے وہاں ایک جلن اور جہاں ٹھوکر لگی تھی وہاں ایک کھٹک سی ہونے لگتی جب فضا خاموش ہوتی تو مجھے ہر طرف باجا سا بجتا سنائی دیتا اور جب کائنات کا ہر ذرہ شور فشاں ہوتا تو میرے لئے ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ گزرا کہ کچھ منچلوں نے دھوپ چھاؤں کے درختوں کے جھرمٹ میں ایک دیوی بٹھائی تھی اور ان کی باتوں سے میں سمجھا تھا کہ یہ میری دلہن ہے۔ ہنوز میں نے اس قسم کے کسی جانور کو نہیں دیکھا تھا، تاہم یہ لفظ کتنا وجد آفریں تھا! میں بہزار جان اس دن کا منتظر رہا جب بہار کی آمد آمد ہو گی اور وہ ننھی سی مورت میرے آغوش میں بٹھلائی جائے گی" لیکن نا گہاں کچھ لکڑہارے ایک روز وہاں آئے اور درختوں کو کاٹنا شروع کیا۔ بعد ازاں میں نے دیکھا کہ وہ جگہ بے برگ و بار پڑی ہے اور وہ مورت بھی سراب کی طرح غائب ہو گئی ہے۔ اب تک مجھے کامل یقین تھا کہ اس بیچاری کو وہ سیہ بخت کہیں پھینک آئے۔ لیکن نہیں — آہ یہ نہ تھا! جب میں نے گزشتہ شب کے واقعات پر غور کیا تو دل پکار اُٹھا کہ اس مورت سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا، وہ خود اُٹھ کر کہیں بھاگ گئی ہے! نہ میری آنکھوں کے آگے یہ دردانگیز سانحہ ہوتا، نہ سکون مجھ پر اس طریقہ سے حرام ہو جاتا۔

جب شام ہوئی تو میری وحشت اور انتشار کا رنگ پلٹا۔ دن بھر تو میں اس ناکام آرزو کو بد دعائیں دیتا رہا تھا کہ کیوں اس عورت کو میرے آستانہ پر بلا کر میری جان پر یہ ستم برپا کیا۔ مگر اب میں دل ہی دل میں منانے لگا کہ وہ پھر آئیں اور مجھے درد آشنا بنائیں، ایک بار دونوں ملکر مجھے ٹھوکریں لگائیں اور اسی وقت سب سے بڑا بُت میری زبان کھولدے اور میں چیخ اُٹھوں

وہ دونوں غم سے پسیج جائیں اور مجھے گود میں اٹھالیں، اپنی گستاخی پر شرمسار ہوں اور میں مچل جاؤں کہ جب تک ہر صبح تم دونوں میری پوجا نہ کروگے، میں ہرگز درگزر نہ کروں گا۔ وہ دونوں مجبور ہو جائیں میرے پاس کٹیا بنا کر رہنے لگیں اور ان کی زندگی اس برگد اور امربیل کی طرح ایک ہو جائے۔ ابھی میں یہ عجیب و غریب منصوبے باندھ رہا تھا کہ وہ نوجوان دور سے آتا ہوا دکھلائی دیا۔ مگر وہ اکیلا تھا۔

اس چبوترے پر سر جھکائے وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب سبزہ کی فراوانی سے زمین پر آسمان کا دھوکہ ہونے لگا تھا اور وہ دونوں اس پیڑ کی ڈال پر جھولا جھول رہے تھے۔ یکایک کسی شریر لڑکے کی غلیل کا نشانہ بن کر ایک مینا زمین پر گری تڑپی اور مرگئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا جوڑا کچھ تنکے لئے ہوئے آیا اور اپنے آشیانہ کو آراستہ کرنے میں مصروف ہو گیا جو ابھی ادھورا پڑا تھا۔ پھر وہ اُسے پکارنے لگا اور جواب نہ پا کر اُسے ہر ہر پتی اور ہر ہر ڈال پر ڈھونڈنے لگا۔ جب اس کی نظر نیچے گئی تو وہ چیخ کر لاش پر گر پڑا اور ہزار طرح اسے جگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ نہ اُٹھی — نہ اُٹھی! پھر وہ ستم زدہ پر سمیٹ کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور مردہ مینا کے ادھ کھلے دیدوں پر اپنی چونچ سے سلائی پھیرنے لگا۔ کبھی وہ بیتابانہ دوسرے پرندوں کے پاس جا کر فریاد کرتا کہ دیکھو بسے ہوئے گھر اس طرح لٹتے ہیں کبھی آسمان سے شکایت کرتا کبھی زمین پر لوٹنے لگتا۔ اس روح فرسا نظارہ کو دیکھنے کی تاب وہ دوشیزہ نہ لا سکی تھی۔ اس کی آنکھیں شبنم فشاں ہو گئیں اور وہ نوجوان سے لپٹ کر سسکیاں بھرتی ہوئی بولی — "وہ بیدرد اسے نہ مارتا تو کیا ہوتا!"

ایک لمبی سانس بھر کر وہ اُٹھا اور دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور آخر اس جگہ آ کھڑا ہوا جہاں کل رات آ کر وہ بیٹھی تھی پھولوں کی وہ پنکھڑیاں اب بھی بکھری ہوئی تھیں جنھیں اُسنے اضطراب میں مسل ڈالا تھا۔ اب وہ مرجھا چکی تھیں۔ اس نے اپنی جیب سے خطوں کا ایک پلندہ نکالا۔ چراغ تبخانہ سے پتنگے درس زندگی لے رہے تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے ہر خط کو لو دکھائی جس کی بھڑک میں محبت کی کہانی دم بھر میں خاکستر ہو گئی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ان میں کیا لکھا تھا۔ صرف اتنا دیکھا کہ آتش بجاں الفاظ غصہ سے آگ کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب خاک سیاہ ہو گئے ماسوا کاغذ کے ان ٹکڑوں کے جن پر آنسو کی بوندوں نے روشنائی پھیلادی تھی۔

وہ ہاتھ باندھے درخت کا سہارا لئے، بت پر ایک پاؤں رکھ کر آنکھیں بند کئے دیر تک کھڑا رہا۔ نیم خوابی کی حالت میں اس نے دیکھا کہ اُس کی زندگی ایک باغ تھی، جہاں کی بہار خزاں دیدہ نہ تھی، جہاں کے غنچے گل چیں کا مذاق اڑاتے تھے۔ یکایک اس میں ایک نیا پودا لہلہایا جس کے سایہ نے سارے باغ کو ڈھک لیا۔ اس سے ایسے ابخرات نکلے کہ کچھ دنوں بعد باغ ویران ہو گیا، کہیں پھل پھول کا نام نہ رہا۔ یہ عشق کا درخت تھا — جس کی دو ٹہنیاں تھیں — سالک اور عورت! اس باغ میں دو نہریں بہتی تھیں جو ان کی جڑوں کو سینچتی تھیں — لگاؤ اور الگاؤ! اکثر یہ ٹہنیاں باہم دست و گریباں ہوتیں اور وہ نہریں آپس میں گتھ جاتیں۔ ایک دن لگاؤ کی نہر سے ایک بیل پھوٹی جس کا نام "غرض" تھا

اور جو عورت کی ٹہنی سے لپٹ گئی۔ ان کی سازش سے دوسری ٹہنی سوکھنے لگی اور دوسری لہر بھی خشک سی ہو گئی۔

ابھی وہ درخت اس چوٹ سے سنبھل ہی رہا تھا کہ زندگی کے باغ میں سماج کا دیو وہم کی کلہاڑی لئے پہونچا اور دوسری ٹہنی پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ بھی ٹوٹ کر گر گئی اور ساتھ ہی وہ بیل بھی سوکھ گئی۔

نوجوان آنکھیں مل کر زور سے بول اٹھا "کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا میرے دونوں شہ پر ٹوٹ گئے۔ کیا میری حقیقت برگد کے اس ٹھونٹھ سے زیادہ نہیں۔ کیا میں اس بت کی طرح بیزبانی کا گلہ کرتے کرتے مرجاؤں گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نسیم زندگانی اس درخت کو تر و تازہ کر کے ان ٹہنیوں کو شاداب بنائے اور ان دونوں میں یگانگی کی روح پھونکے...... یا میں اس ویران نخلستان کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بساؤں جس میں بربادی کے سرچشمہ سے خلاء کا بیج پھوٹے جس کا زہر زندگی اور موت دونوں کو ہلاک کر دے!

یہ سوچتا اور مسلے ہوئے پھولوں کی خاک جلائے ہوئے خطوں کی راکھ کے ساتھ ہوا میں اڑاتا ہوا وہ چلا گیا۔ ایک مدت گزری، تاہم میں روز شام کو ان کا انتظار کرتا ہوں اور اکثر میرے کانوں میں اس کا وہ جملہ گونجا کرتا ہے جو بوقت وداع بکمال حسرت و یاس اس کی زبان پر تھا ـــ "یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا"

زمین آسمان ہوتی اور آسمان زمین ہوتا تو کیا ہوتا! جنت جہنم ہوتی تو کیا ہوتا! دنیا کا ہر حسین بدصورت اور ہر بدصورت حسین ہو جاتا تو کیا ہوتا! اہرمن یزداں ہوتا تو کیا ہوتا! اگر زندگی بڑھاپے سے شروع ہو کر بچپن پر ختم ہوتی تو کیا ہوتا! یہ بت خدا بن جاتا اور خدا بت ہوتا تو کیا ہوتا ـــ حسن باوفا ہوتا اور عشق بے وفا ہوتا تو کیا ہوتا! وہ مرد دھوکہ نہ کھاتا تو کیا ہوتا ـــ وہ عورت دھوکہ نہ دیتی تو کیا ہوتا۔

ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے۔
یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔

اختر حسین رائے پوری

فلسفۂ مذہب صرف ۸ر میں

اردو میں پہلی کتاب ہے جو اسلامی شعائر و عقاید پر ناقدانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اس کا مطالعہ کرے۔ چونکہ اسکی جلدیں کم رہ گئی ہیں اسلئے اسٹاک ختم کرنے کے لئے بجائے ایک روپیہ کے ۸ر میں مل سکتی ہیں۔ محصول اسکے علاوہ ہوگا۔ منیجر نگار

اپنے خط کا جواب

دفتر سے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جواب کے لئے ٹکٹ روانہ کیجئے۔ منیجر نگار

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۸ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب سید خورشید حسین صاحب بہادر جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۳ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیٰ بُلاقی ولد تپو خاکروب محلہ فراش خانہ مصطفےٰ منزل تھانہ چوک کوتوالی

بنام

۱ــــ گوپال ولد جے نراین رستوگی ساکن محلہ رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ

۲ــــ گنگا دھر ولد رام داس قوم رستوگی "

۳ــــ بلدیو داس ولد لچھمن داس رستوگی ساکن بیگم گنج تھانہ چوک شہر لکھنؤ

۴ــــ لالہ متھری ولد نامعلوم قوم رستوگی ساکن باغ مکا "

۵ــــ سندر لال رستوگی ملازم جگل کشور رستوگی باغ مکا تھانہ چوک کوتوالی شہر لکھنؤ

۶ــــ سندر لال بقال ساکن شیوالہ بھوانہ سنگھ متصل ٹاٹ پٹی "

۷ــــ مدن موہن رستوگی بازار کھالہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۳۱ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۱۵ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۵ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جایداد غالباً مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ اٹھارہ ۱۸ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء بنابر مزید سماعت، درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جایداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اُس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعویٰ کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اُس کے قبل داخل کر دینا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

دستخط منصرم

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک